خدا کو پانے والے

خدا کی حمد خدا کو پائے بغیر کرنا ممکن نہیں۔ اور اس مادی دنیا میں رہ کر خدا کو پانا بہت مشکل کام ہے۔ یہ وہ کام ہے جس سے روکنے کے لیے ذریت ابلیس کے ہزاروں لاکھوں فرزند ہمہ وقت مصروف ہیں۔ یہ وہ کام ہے جس کی انجام دہی میں سب سے بڑی رکاوٹ خود انسان کا اپنا نفس ہے۔ مگر یہی وہ مشکل کام ہے جس کا اخروی بدلہ جنت کی ابدی بادشاہت ہے اور دنیوی بدلہ حمد باری تعالیٰ کی توفیق ہے۔

خدا کو پانے کے لیے دنیا میں رہ کر دنیا سے اوپر اٹھنا ہوتا ہے۔ خدا کو پانے کے لیے اپنی خودی اور انا کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ خدا کو پانے کے لیے اپنے قومی اور فرقہ وارانہ تعصّبات سے اوپر اٹھنا پڑتا ہے۔ ورنہ لاکھوں کروڑوں لوگ ایسے ہیں جو خدا کا نام لیتے ہیں، مگر در حقیقت وہ اپنے تعصّبات کے بندے ہیں۔ ایسے لوگوں کو فیضان الٰہی سے ایک ذرہ بھی نہیں ملتا۔ چاہے وہ ہزار سجدے کریں۔ چاہے وہ ہزار مذہب کا نام لیں۔

خدا کا فیضان انہی کو ملتا ہے جو ہوا کی سرسراہٹ میں خدا کی رحمت، سورج کی روشنی میں خدا کی عنایت، تاروں کی جگمگاہٹ میں خدا کی شفقت کو دریافت کرلیں۔ جو انفرادی نعمتوں کے ساتھ سورج اور چاند جیسی آفاقی نعمتوں کا شکر بھی ایسے ادا کریں جیسے یہ ان پر خدا کی ذاتی مہربانی ہو۔ جو آزادی کے ہر لمحے میں یہ یاد رکھیں کہ خدا غیب میں تو ہے مگر ہر لمحہ ان پر نگران ہے۔ جو مشکل کے ہر لمحے میں یہ یاد رکھیں کہ حالات سخت تو ہیں مگر خدا کی قربت اسی مشکل میں ہے۔ جو نعمت کے ہر لمحے میں یہ یاد رکھیں کہ سبب کوئی بھی ہو مگر دینے والا وہی مہربان ہے۔

یہی لوگ خدا کو پانے والے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے آنسو اور آہیں سب اپنے آقا کے لیے وقف ہیں۔ یہی لوگ ہیں جنہیں اِس دنیا میں خدا اپنی حمد کے لیے اور اُس دنیا میں اپنی عطا کے لیے چنتا ہے۔

جمے رہو

نومبر 2016 میں ڈونلڈ ٹرمپ کو امریکی صدر منتخب کیا گیا۔ وہ اپنی صدارتی مہم کے دوران ہی میں اپنے متنازعہ بیانات کی وجہ سے موضوع گفتگو بنے رہے۔ خلاف توقع وہ صدر منتخب ہوگئے تو امید کی جا رہی تھی کہ وہ کچھ معقولیت کا مظاہرہ کریں گے، مگر وقفے وقفے سے ان کی طرف سے ایسی باتیں آتی رہتی ہیں جو محتاط ترین الفاظ میں روایت سے ہٹی ہوئی کہی جا سکتی ہیں۔

انھی میں سے ایک وہ ٹویٹ ہے جو 28 دسمبر کو اسرائیل کی حمایت میں اس طرح کیا گیا۔

Stay strong Israel, January 20th is fast approaching!

یہ اشارہ ہے سلامتی کونسل کی اس قرار داد کی طرف جو امریکہ کے ویٹو نہ کرنے کی وجہ سے 36 برسوں میں پہلی دفعہ اسرائیل کے خلاف منظور ہوئی۔ اس پر اسرائیل آپے سے باہر ہے۔ یہ ٹویٹ اسرائیل کو تسلی دینے کے لیے کیا گیا ہے۔ جس پر اسرائیلی وزیر اعظم بنجمن نتن یاہو نے ان کا شکریہ ادا کیا ہے۔ ساری دنیا کے انتہا پسند یہودی ٹرمپ کی اس تسلی پر مطمئن ہوگئے ہیں۔

ایک مسلمان کے لیے اس واقعے میں بڑی رہنمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن مجید میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو بشارت دی ہے۔ اس بشارت کا خلاصہ یہ ہے کہ اہل ایمان صبر کے ساتھ نیکی کی راہ پر جمے رہیں کیونکہ قیامت کا دن قریب ہے۔ اور اس دن اللہ اہل ایمان ہی کو سرخرو کرے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ ڈونلڈ ٹرمپ ایک انسان ہیں جن کو اپنے کل کا کچھ نہیں معلوم، مگر ان کے ایک بیان پر یہودیوں کی خوشی کا یہ عالم ہے۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ کائنات کے بادشاہ ہیں۔ جب وہ یقین دہانی کرا دیں تو پھر کبھی کسی مومن کی زندگی میں مایوسی نہیں آنی چاہیے۔ اسے ایمان و اخلاق کے تقاضوں پر جما رہنا چاہیے۔ کیونکہ قیامت کے آنے میں کوئی شک نہیں۔

شام کا مرثیہ

لوگ عرصے سے مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ میں شام پر لکھوں۔ سوال یہ ہے کہ کیا لکھوں؟ مرثیہ لکھوں یا نوحہ پڑھوں؟ مسلمانوں کی جدید تاریخ کا یہ پہلا المیہ ہوتا تو شاید لکھ دیتا۔ دو صدیاں ختم ہوگئیں، پر المیے ختم نہیں ہوتے۔ مگر اصل المیہ یہ نہیں۔ ہمارا اصل المیہ یہ ہے کہ ہمارا کوئی المیہ آخری المیہ نہیں ہے۔

شروع شروع میں نوحے اور مرثیے ہی پڑھے۔ پھر مالک ذوالجلال نے اپنی کتاب تک پہنچادیا۔ حقیقت دن کی روشنی کی طرح کھل گئی تو جوش و جذبے کے ساتھ سبق لکھنے لگا۔ اس کے جواب میں جو کچھ ہوا وہ ایک الگ داستان ہے۔ اس کا ذکر جانے دیجیے۔ مگر ہمارا کام خدا کے پیغام کو ہر حال میں زندہ رکھنا ہے۔ چاہے ہم زندہ رہیں یا نہ رہیں۔ اس لیے وہ سبق پھر سنا دیتے ہیں جو چار ہزار سال سے تمام صحف سماوی اور انبیا علیھم السلام کی تاریخ کا خلاصہ ہے۔

نبوت ختم ہوچکی ہے۔ اب اسلام کے نام لیوا اجتماعی طور پر پیغام رسالت کے امین ہیں۔ انھیں اپنے قول اور فعل سے ایمان و اخلاق کی شمع کو روشن رکھنا ہوگا۔ وہ یہ کریں گے تو دنیا کا اقتدار ان کو دے دیا جائے گا۔ نہیں کریں گے تو ذلت اور مغلوبیت ان پر مسلط کردی جائے گی۔ کیونکہ یہ خدا سے غداری ہے۔ اس جرم پر نہ یہود کو چھوڑا گیا نہ مسلمانوں کو چھوڑا جائے گا۔

اپنی کتاب ''آخری جنگ'' میں ہم چار ہزار برس کی یہ پوری داستان اور یہ سبق اپنے تمام دلائل کے ساتھ جمع کر چکے ہیں۔ بخت نصر سے ٹائٹس رومی تک اور تاتاریوں سے لے کر موجودہ غیر مسلموں تک جو کچھ اسلام کے نام لیواؤں کے ساتھ ہوا، وہ سزا و جزا کا خدائی قانون ہے۔ یہ قانون میرے اور آپ کے مرثیوں سے نہیں بدلے گا۔ خود کو بدلیں۔ ایمان و اخلاق کی شمع کو پھر روشن کر دیجیے۔ غلبہ آپ کا ہوگا۔ ورنہ اطمینان رکھیے، ہمارا کوئی المیہ آخری المیہ نہیں۔

مردوں کی شادیاں

پچھلے دنوں ایک بہن نے اپنا یہ مسئلہ مجھ سے ڈسکس کیا کہ ان کا شوہر دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔ پہلی بیوی سے کئی بچے ہیں، وہ خوش بھی ہیں، مگر چونکہ خوشحال ہیں اس لیے دوسری شادی کا سودا بری طرح سوار ہوگیا ہے اوراس کے بغیر باز آنے کو تیار نہیں۔

ہمارے سماجی پس منظر میں عام طور پر دوسری شادی کو پسندیدہ نہیں سمجھا جاتا۔ چنانچہ جب مردوں کو یہ کرنا ہوتا ہے تو وہ مذہب اور شریعت کو اپنی حمایت میں پیش کرتے ہیں۔ اتفاق سے پچھلے دنوں بعض ایسی مشہور شخصیات کی حادثاتی موت یا قتل کا سانحہ پیش آیا جو مذہبی طور پر معروف تھے اور شوبز سے متعلق بھی تھے۔ان کا جہاں اور پہلوؤں سے میڈیا پر تذکرہ رہا وہیں ان کی دو تین شادیوں کی خبریں بھی عام ہوئیں۔ جس سے لوگوں میں یہ تاثر قوی ہوا کہ اسلام ایک سے زیادہ شادیوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک سے زیادہ شادیاں زمانہ قبل از اسلام سے عرب کا ایک رواج تھیں۔ جنگ احد کے موقع پر جب مدینے کی چھوٹی سی بستی میں ستر لوگ شہید ہوگئے اور ہر چوتھے گھر میں کوئی خاتون بیوہ اور بچے یتیم ہوگئے تو اسلام نے اس رواج سے فائدہ اٹھا کر یتیم و بیواؤں کی سرپرستی کا راستہ دکھایا۔اس میں بھی بیویوں کے درمیان عدل اور زیادہ سے زیادہ چار شادیوں کی حد مقرر کردی گئی۔

یہ اسلام کی تعلیم ہے۔ جبکہ پیغمبر اسلام کا معاملہ یہ ہے کہ آپ نے 51 برس تک حضرت خدیجہ کے سوا کسی خاتون سے نکاح نہ کیا۔اس کے علاوہ آپ نے باقی ساری شادیاں بیواؤں اور یتیموں کو سہارا دینے یا کسی دینی مصلحت سے کی تھیں اور سب کی سب بیوہ مطلقہ عورتوں سے کیں۔ آپ کی واحد کنواری بیوی حضرت عائشہ تھیں جن سے آپ نے اللہ کے حکم پر شادی کی (بخاری،

5078)۔اس شادی کی حکمت یہ تھی کہ سیدہ ایک غیر معمولی ذہین ٹین ایجر خاتون تھیں۔اللہ کی مرضی یہ تھی کہ وہ ایک دہائی تک رسالتمآب کے ساتھ رہ کر دین سیکھتی رہیں اور اپنی کم عمری کی بنا پر حضور کے بعد بھی اگلی کئی دہائیوں تک امت کو تعلیم دیتی رہیں۔

آج بھی ہم اجازت کو اپنے متعدد سماجی مسائل کے حل کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ہمارے ہاں بڑی تعداد میں جوان لوگ حادثات، جرائم اور بیماریوں میں مارے جاتے اور اپنے پیچھے بیوائیں اور یتیم چھوڑ جاتے ہیں۔اسی طرح گھروں میں ایک بڑی تعداد ان لڑکیوں کی ہے جن کی شادی کی عمر مختلف اسباب سے نکل گئی ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایسی خواتین اور بچے بے سہارا رہ جاتے ہیں۔ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا اور اکثر وہ نفسیاتی مریض بن کر رہ جاتے ہیں۔

ایسے میں صاحب حیثیت مرد اگر ان خواتین اور بچوں کو سہارا دینے کے لیے آگے بڑھیں تو یہ بہت بڑی نیکی ہوگی اور اس کا اجر وہ اللہ کے ہاں پائیں گے۔لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں دوسری تیسری شادی کا خیال صرف اس خوشحال شخص کو آتا ہے جس کے سامنے کوئی خوبصورت اور جوان عورت آجائے اور وہ عورت بھی اس کے مال وشہرت سے متاثر ہوکر اس سے شادی کرنے پر تیار ہوجائے۔اس کے بعد سماجی دباؤ کا مقابلہ کرنے کے لیے لوگ اسلام اور پیغمبر اسلام کو بیچ میں لاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں دوسری شادی ممنوع نہیں لیکن ہم اسلام اور پیغمبر اسلام کی زندگی سے یہ بتا چکے ہیں کہ اسلام میں دوسری شادی کی تلقین اصلاً یتیموں اور بیواؤں کی مدد کے لیے کی گئی ہے۔بدقسمتی سے کوئی شخص دوسری، تیسری اور چوتھی شادی کے اس پہلو پر توجہ نہیں دلاتا۔بلاشبہ جس مقصد کے لیے اسلام نے دوسری شادی کی تلقین کی ہے وہ ایک عظیم خدمت ہے۔وہ ایک عظیم قربانی ہے۔یہ وہ چیز ہے جس کو نمایاں ہوکر سامنے آنا چاہیے۔

مطالعہ اور ذہنی صحت

ہمارے ہاں مطالعے کا رجحان بہت کم ہوگیا ہے۔ جو کچھ مطالعہ کیا جاتا ہے وہ زیادہ تر اخبارات پڑھنے اور سوشل میڈیا پر آنے والی مختصر تحریروں تک ہی محدود رہ گیا ہے۔ بیشتر لوگ اب ٹی وی دیکھنے یا یوٹیوب وغیرہ کی وڈیو دیکھنے ہی کو عمومی معلومات کے حصول کا ذریعہ بنا چکے ہیں۔

تاہم حقیقت یہ ہے کہ مطالعے کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ سوشل میڈیا یا الیکٹرونک میڈیا سے جو معلومات ملتی ہیں وہ عام طور پر انفارمیشن بمباٹمنٹ کی شکل میں مسلسل برستی رہتی ہیں۔ جس کے بعد وہ یادداشت اور شعور کا حصہ نہیں بن پاتیں۔ ایک چیز ذہن میں بیٹھتی بھی نہیں ہے کہ دوسری چیز آ کر اسے نکال دیتی ہیں۔ جبکہ کتاب کا مطالعہ معلومات کا ایک تسلسل ہوتا ہے۔ کتاب سے پڑھی ہوئی چیزیں پوری نہ سہی کچھ نہ کچھ یاد ضرور رہ جاتی ہیں۔ مطالعہ کے اور بھی دیگر کئی فوائد ہیں مگر اس کا ایک اہم مادی فائدہ ذہنی صحت کے پہلو سے ہے۔

یہ معلوم بات ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ انسان کی یادداشت کمزور ہونا شروع ہوجاتی ہے۔ ابتداء میں انسان کا نئی چیزیں یاد کرنے اور یاد رکھنے کا عمل متاثر ہوتا ہے۔ انسان جتنی تیزی اور آسانی بچپن میں چیزیں یاد کر لیتے ہیں جوانی میں اس طرح نہیں کر پاتے۔ اس کے بعد اگلا مرحلہ بہت غیر محسوس طریقے پر شروع ہوتا ہے۔ اس میں انسان یاد رکھی ہوئی اور معلوم چیزوں کو بھولنا شروع ہوجاتا ہے۔ رفتہ رفتہ چھوٹی چھوٹی اور روزمرہ کی باتیں یاد رکھنا بھی کٹھن ہوجاتا ہے۔

مطالعہ اس مسئلے کے حل میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ مطالعہ کا عمل ورزش کی طرح کام کرتا ہے۔ جس طرح ورزش کرنے کی عادت انسان کو جسمانی طور پر فعال رکھتی ہے، اسی طرح

مطالعہ کرنے کا عمل انسان کے دماغ کو چاق و چوبند رکھتا ہے۔ مطالعہ میں ہمیشہ نئ باتیں سیکھی جاتی ہیں۔ نئ معلومات ملتی ہیں۔ انسان ان چیزوں کے بارے میں سوچتا ہے۔ انھیں سمجھتا ہے۔ پھر کتاب کا اصول یہ ہوتا ہے کہ آگے پڑھنے کے لیے پیچھے کی بات یاد رکھنا پڑتی ہے۔ یہ مشقت انسان کی ذہنی صلاحیت کو مضبوط بنانا شروع کرتی ہے۔

اس کے ساتھ ایک دوسرے پہلو سے مطالعہ ذہن کو آرام و راحت بھی دیتا ہے۔ مطالعہ کرنا ہمیشہ انسان کو نئ چیزوں اور نئ دنیا سے آگاہ کرتا ہے۔ یہ ذہنی دریافت ایک نوعیت کی ذہنی سرشاری، خوشی اور سرور کا باعث بنتی ہے۔ اس سے انسان دماغی طور پر تروتازہ اور فریش محسوس کرتا ہے۔ یہ چیز بھی ذہنی صلاحیت میں اضافہ کا سبب بنتی ہے۔

اس ضمن کی ایک آخری بات یہ ہوتی ہے کہ مطالعہ کرنا ابتدا میں بہرحال ایک مشقت کا کام ہے۔ اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ پہلے ان چیزوں کا مطالعہ کرنے کی عادت ڈالی جائے جن کا مطالعہ باعث دلچسپی ہو۔ یعنی کہانی یا ناول وغیرہ لوگ شوق سے پڑھتے ہیں۔ اسی طرح مختصر مگر موثر تحریریں بھی مطالعہ کی عادت ڈالنے میں بہت مفید ہوتی ہیں۔ ایک دفعہ جب مطالعہ کی عادت ہوجاتی ہے تو پھر انسان اس کے بغیر رہ نہیں سکتا۔ پھر انسان ہر روز اچھی کتابوں یا تحریروں کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے۔ یہ عمل انسان کی علمی اور ذہنی استعداد میں مسلسل اضافے کا سبب بنتا ہے۔

اس ضمن کی آخری بات یہ ہے کہ مطالعہ سیکھنے کا ایک عمل ہے۔ سیکھنے کا عمل انسان کی ترقی کا ایک بنیادی سبب ہے۔ جو لوگ زندگی میں سیکھتے رہتے ہیں وہی دنیا میں مسلسل ترقی کرتے ہیں۔ جو لوگ سیکھنا بند کردیتے ہیں وہ اپنی ترقی کا راستہ بند کردیتے ہیں۔

ایسے میں ہم میں سے ہر شخص کی یہ عادت ہونا چاہیے کہ وہ مطالعہ کو معمول بنالے۔ ساتھ ساتھ اپنی اولاد کو بھی اس کی تلقین کرے۔ ان کو اچھی کتابیں خرید کر دے اور ان میں مطالعہ کا ذوق پیدا کرے۔ اس سے وہ تعلیمی عمل میں اپنے ساتھیوں سے بہت آگے نکل جائیں گے۔

دیانت اور بصیرت

یہ ایک دیکھنے والی وڈیو ہے جس کے تاثر کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ وڈیو آج کل سوشل میڈیا پر شام کے تنازع کے پس منظر میں پھیلی ہوئی ہے، مگر میں نے اس کو ایک بالکل مختلف زاویے سے دیکھا۔

یہ امریکی سینیٹ کی آرمڈ (Armed) سروسز کمیٹی کی ایک سماعت ہے۔ اس میں امریکی وزیر دفاع ایش کارٹر اور امریکی فوج کے سب سے بڑے عہدہ دار چیئر مین آف دی جوائنٹ چیفس آف اسٹاف جوزف ڈنفورڈ؛ ایک سینیٹر گراہم کے سوالات کے جواب دے رہے ہیں۔ آگے بڑھنے سے پہلے غور کیجیے کہ کون سوال کررہا ہے یعنی ایک عام سینیٹر۔ اور کون جواب دے رہا ہے یعنی وزیر دفاع اور فوج کا سب سے بڑا عہدیدار فور اسٹار جرنل۔

یہ دونوں حضرات دنیا کی سب سے بڑی فوجی قوت اور امریکی صدر کی نمائندگی کررہے ہیں۔ جبکہ سینیٹر گراہم امریکی عوام کی نمائندگی کرتے ہوئے ان سے انتہائی بامعنی سوال کرتے ہیں اور دونوں کو لاجواب کردیتے ہیں۔ وہ 2015 میں کھڑے ہوکر ان کی اس غلط پالیسی کے نتائج ان پر واضح کردیتے ہیں، جواب دنیا بھر کے سامنے آچکے ہیں۔ یہ سوال و جواب ایک سیاستدان کی بصیرت کا ایک اعلیٰ نمونہ ہیں۔

دوسری طرف سوالات کا لب ولہجہ ایک اور چیز کی عکاسی کرتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ایک باس اپنے دو ملازموں سے ان کو دیے گئے کاموں کے متعلق پوچھ گچھ کررہا ہے اور وہ دونوں کٹہرے میں کھڑے ہوکر اس کو جواب دے رہے ہیں۔ خاص کر جب فوج کا سربراہ ایک سوال کے جواب میں کہتا ہے کہ I don't know تو سینیٹر انتہائی ترشی سے پلٹ کر پوچھتا ہے کہ What do you mean you don't know۔ پوچھنے والے میں یہ اعتماد اپنی دیانت

کے بل بوتے پر آیا ہے۔ اس نے سینیٹ کی نشست دو کروڑ امریکی ڈالر کے عوض نہیں حاصل کی۔ نہ اس دو کروڑ کی انویسٹمنٹ کو وہ چار کروڑ میں بدلنے سینیٹ آیا ہے۔ بلکہ وہ امریکی عوام کی نمائندگی کرنے آیا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس نے وزیر دفاع اور فوج کے سربراہ کو ملازموں کی طرح اس کے سامنے جواب دینے پر مجبور کر دیا ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے ملک میں سیاستدان جمہوریت کی رٹ لگانے کو کافی سمجھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دنیا بھر میں جموریت کو قبول عام ہو گیا ہے تو پاکستان کے مقتدر حلقے بھی ان کے سامنے ملازموں کی طرح کھڑے ہو جائیں گے۔ دنیا میں کوئی طاقتور، بددیانت اور بے بصیرت لوگوں سے مرعوب نہیں ہوتا۔ طاقت کو اپنے سامنے جھکانے کے لیے دیانت اور بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے پاکستانی سیاستدانوں میں یہ دونوں خصوصیات یا ان میں سے ایک اکثر و بیشتر عنقا نظر آتی ہے۔

ہمارے بعض سیاستدان ایسے ہیں جن کو ایک پورے صوبے میں اقتدار حاصل ہے۔ مگر حال یہ ہے کہ پورا صوبہ افریقہ کے کسی پس ماندہ ملک کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ ملک کے سب سے بڑے شہر کو کچرا کنڈی بنا دیا گیا ہے۔ دیانت کا عالم یہ ہے کہ میرٹ پر بھرتیاں کرنے کے جرم میں صوبے کے پولیس چیف کی چھٹی کر دی جاتی ہے۔

کچھ سیاستدان ایسے ہیں جن کی کل بصیرت یہ ہے کہ وہ ملک کی تقدیر بدلنے کے لیے وزیر اعظم بننا ضروری سمجھتے ہیں۔ جو اپنے پاس حاصل مواقع کو بالکل نظر انداز کر کے ان چیزوں کے پیچھے کئی برس ضائع کر چکے ہیں جن سے ان کو کچھ نہیں ملنا۔ چنانچہ آخر کار نہ انھیں ''ایمپائر'' سے کچھ ملتا ہے اور نہ ملک کی سب سے بڑی عدالت سے۔

کچھ سیاستدان وہ ہیں جو پورے ملک کو چند سو کلومیٹر کے علاقے پر محیط سمجھتے ہیں۔ اس کی

ترقی کے سوا ان کو کچھ نظر نہیں آتا۔ جو زیادہ سے زیادہ عوام کی خدمت کے بجائے زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔

جہاں سیاستدانوں کی بصیرت اور دیانت کا یہ حال ہو وہاں ملک کا آرمی چیف خود کو وزیراعظم کے سامنے بھی جواب دہ نہیں سمجھتا۔ مگر جہاں سیاستدانوں میں بصیرت اور دیانت ہو وہاں ایک سینیٹر بھی وزیر دفاع اور آرمی چیف سے اس طرح سوالات کرتا ہے جیسے دونوں اس کے ذاتی ملازم ہوں۔

ایسے حالات میں سب زیادہ اہم کردار دانشور طبقات کا ہے۔ انھیں ایک طرف عوام کی حکمرانی کے نظام کے تحفظ کی بات کرنا چاہیے اور دوسری طرح اس کے لیے درست طریقہ کار کی طرف رہنمائی کرنا چاہیے۔ پاکستان میں اب جمہوریت کافی نہیں ہے۔ پاکستان میں تین سالہ جمہوریت کی ضرورت ہے جس میں سیاستدانوں کو ہر تین سال بعد عوام کے پاس جا کر اپنا مینڈیٹ دوبارہ لینا ضروری ہو۔ جمہوریت میں شفافیت کے لیے انگوٹھے کے نشان کی تصدیق کے ساتھ ووٹ ڈالنے کا طریقہ رائج کرنے کی ضرورت ہے۔ سیاستدانوں کے احتساب کا نیا نظام بنانے کی ضرورت ہے۔ زیادہ پیسے کے بجائے اچھی شہرت کی بنیاد پر سیاسی انتخاب کا طریقہ کار وضع کرنے کی ضرورت ہے۔ صوبائی خومختاری کے بجائے مقامی طور پر خودمختار حکومتوں کی ضرورت ہے۔

یہ چند نکات جو ہم نے اوپر بیان کیے ہیں پاکستان کے جمہوری نظام کی بقا اور عوام کی بہتری کا واحد ممکنہ راستہ ہیں۔ اس کے بغیر عوام اور ملک دونوں کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی چلی جائے گی۔ پاکستان میں جمہوریت آ چکی ہے۔ اب جمہوریت کا نعرہ بند کر کے نیا نعرہ یہ لگانا ہوگا کہ ہمیں سیاستدانوں کے مفادات پر مبنی جمہوریت نہیں چاہیے بلکہ عوام کی خدمت پر مبنی جمہوریت چاہیے۔ یہی ہمارے لیے راہ نجات ہے۔

سوال و جواب

ابو یحییٰ

اصلاح کا آغاز کہاں سے کیا جائے؟

سوال:

السلام علیکم ورحمت اللہ و برکاتہ

سر انسان کو اپنی اصلاح کا آغاز کس بنیادی نکتے سے کرنا چاہئیے ؟؟ مثال کے طور پر مجھ میں بہت ساری برائیاں ہیں اور میں اپنی اصلاح کی خواہاں ہوں تو سب سے پہلے کیا چیز ہونی چاہئے جس پر فوکس ہو کر اس کو ٹھیک کرنے یا اس کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

یسریٰ اصمعی

جواب:

وعلیکم السلام ورحمت اللہ و برکاتہ

اپنی اصلاح کے آغاز کا لائحہ عمل ہر شخص کے لیے کچھ مختلف ہو سکتا ہے۔ تاہم عمومی طور پر اس میں دو باتوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ جن برائیوں کا چھوڑنا آسان ہو پہلے ان سے شروع کرنا چاہیے۔ اس کے بعد ان برائیوں پر توجہ مرکوز کرنا چاہیے جن کو چھوڑنے میں دقت پیش آتی ہے۔

دوسری بات یہ کہ اس کے ساتھ اپنے علم کی سطح کو بڑھاتے رہنا چاہیے خاص کر وہ علم جس کا مقصد اصلاح و تربیت ہے۔ اس مقصد کے لیے آپ ہمارے تربیتی کورس جوائن کر سکتی ہیں۔ اس علم سے آپ کو معلوم ہوگا کہ کون سی غلطیاں اور برائیاں ہم میں موجود ہیں مگر ہم ان کو برا نہیں جانتے۔ انشاء اللہ اس طرح آپ کے اندر اصلاح اور بہتری کا ایک مسلسل عمل شروع ہو جائے گا۔

جزاک اللہ کا درست تلفظ

سوال:

السلام علیکم، جزاک اللہ خیراً کا درست تلفظ کیا ہے۔ یعنی اللہ پر پیش آئے گا یا زیر آئے گا، ثمر عمیر

جواب:

وعلیکم السلام ورحمت اللہ وبرکاتہ

جزاک اللہ خیرا میں اللہ حالت رفعی میں ہے۔ یعنی اس پر پیش پڑھا جائے گا۔ تاہم یہ عربی کا معاملہ ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ الفاظ اور تراکیب دوسری زبان میں منتقل ہوجاتے ہیں۔ ایسی صورت میں پہلی زبان کے تلفظ پر اصرار کرنا زبان و بیان کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے۔ خود عربی زبان کو دیکھ لیجیے۔ آج کل کتنے ہی انگریزی الفاظ عربی میں مستعمل ہوچکے ہیں۔ مگر ان کا تلفظ بدلا ہوتا ہے اور کوئی عربی چاہے وہ انگریزی جانتا ہو اسے غلط نہیں سمجھتا۔ اس لیے اردو میں جزاک اللہ خیرا کے اللہ پر زیر پڑھ لیا جائے تو یہ کوئی سنگین مسئلہ نہیں۔

اردو میں پہلے ہی ایسا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر لفظ سوال کے س پر عربی میں پیش ہے۔ مگر ہم سب اسے زبر کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ مگر آج کل بعض لوگ اس پر بہت اصرار کرنے لگے ہیں کہ سُوال پڑھا جائے۔ یہ مطالبہ بھی غیر فطری ہے۔ اسی طرح یا رسول اللہ کی ترکیب میں عربیت کی رو سے رسول پر زبر آنا چاہیے۔ مگر اردو میں عام طور پر لوگ پیش بول دیتے ہیں۔ اس سے بھی تلفظ غلط نہیں ہوجاتا۔

عربی زبان کے درست تلفظ کا اہتمام یا تو عربی زبان بولتے وقت کرنا چاہیے یا قرآن مجید کی تلاوت کرتے وقت۔ اردو میں عربی تراکیب یا الفاظ کے اصل تلفظ کا مطالبہ درست نہیں۔ ہاں کوئی کرنا چاہے تو کرلے۔

فرح رضوان

نیت

امی میں بہت تھک گئی ہوں۔ پتہ نہیں آپ نے کیسے اتنے رشتے نبھا لیے۔ اتنے بچوں کو پال لیا۔ میں تو تین دن میں تھک گئی۔ آپ تو گھر کی بڑی تھیں، کیسے نندوں اور دیوروں کی شادیوں میں دادی جان کے ساتھ رہیں۔ نانا جان تو بہت امیر آدمی تھے لیکن ابو کی آمدنی تو بہت قلیل تھی۔ ہمارا ددھیال تو بہت بڑا تھا اور جوائنٹ سسٹم پھر آپ کے بھی آٹھ بچے۔ سب کو پڑھایا لکھایا قابل بنایا، دینی اور دنیاوی تربیت کی، پھر سب کی شادیاں کیں۔ اب مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے کتنی تکلیفیں اٹھائیں اور کبھی اظہار تک نہیں کیا۔

آج امی کا فون آیا تو صبا پھٹ پڑی اس کا دل رونے کو چاہ رہا تھا پہلے رمضان سے اس کی چھوٹی نند اپنے بچوں کے ساتھ حیدرآباد سے اسلام آباد اپنی والدہ اور بھائی کے پاس آئی ہوئی تھی۔ اگرچہ تین سال بعد آئی تھی لیکن عید کر کے جانے کا ارادہ تھا آج تیرہواں روزہ تھا صبا کا ایک ایک دن بھاری ہو رہا تھا۔ سارا روٹین بچوں کی چھٹیوں اور رمضان کی وجہ سے آؤٹ ہو چکا تھا۔ اوپر سے نند کے آنے سے بچے بہت خوش تھے۔ اپنے کزنز کے ساتھ مل کر خوب چھٹیوں کو انجوائے کر رہے تھے۔

وہ دو بجے سے سحری بنانے کے لیے کچن میں لگ جاتی تھی۔ اگرچہ نند اس کے ساتھ مستقل لگی رہتی لیکن ذمے داری تو صبا کی ہی تھی۔ فجر کے بعد چند گھنٹے کی نیند ہوتی پھر ضعیف ساس کے لیے اٹھ کر ان کو ناشتہ دینا، دوپہر کے لیے ان کا پرہیزی کھانا بنانا، پھر جن چھوٹے بچوں کا روزہ نہ ہوتا ان کے کھانے کا انتظام کرنا۔ صبا کی نند صالحہ بہت سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ اس نے صبا کی کئی ذمے داریاں اپنے ذمے لے لی تھیں۔ اپنی والدہ کو سنبھالنا، ان کا پرہیزی کھانا بنانا اور ان کو

کھلانا، یہ سب اس نے یہ کہہ کر اپنے ذمے لے لیا تھا کہ یہ نیکی تو دن رات آپ ہی کما رہی ہیں۔ میں تو دور ہوں، اس لیے جب تک میں ہوں مجھے ماں کی خدمت کا موقع دیں۔

صبا ہمیشہ پر تکلف کھانوں اور افطاری کا اہتمام کرتی تھی۔ ہر بچے کی الگ پسند کی افطاری اور کھانا ہوتا تھا جس سے ٹیبل بھر جاتی تھی۔ یہ اس کی نظر میں برکت تھی لیکن یہ سسٹم صالحہ نے آ کر چینج کروا دیا۔ افطاری روزانہ پر تکلف نہ ہونا اور کھانے میں ایک ڈش اور وہی سحری میں۔ شروع میں صبا کو عجیب سا لگا۔ لیکن ایک دو دفعہ ایسا کرنے سے سہولت محسوس ہوئی اور سب سے بڑھ کر اس کے نخریلے بچے صالحہ کے بچوں کے ساتھ مل کر جو ایک چیز بنتی، وہی بغیر کسی شکایت کے کھا لیتے۔ صبا کو احساس ہو رہا تھا کہ جس چیز کو وہ برکت خیال کر رہی تھی وہ تو اصل میں اسراف تھا۔

اب صبا کو یہ سسٹم اچھا تو لگ رہا تھا، لیکن اس کی الجھن اور ذہنی تھکاوٹ کا باعث اس کی ضعیف ساس تھیں جو ہمیشہ سے مشرقی روایتی ساس رہیں تھیں۔ بیماری اور بڑھاپے نے ان کے مزاج میں مزید تلخی پیدا کر دی تھی۔ ان کو اپنی بیٹی کا کام کرنا، سادہ کھانا کھانا؛ اپنی بہو کی لاپرواہی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ روٹین میں صبا کے پر تکلف کھانوں کو دیکھتی رہیں تھیں اور صبا کے میکے والوں کے آنے پر ہونے والے اہتمام بھی ان کے ذہن میں تھے۔ جس کی وجہ سے ماحول میں کھنچاؤ سا پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے صبا بیزار تھی اور آج سارا دکھ ماں سے کہہ ڈالا۔

نفیسہ بیگم بردبار اور سنجیدہ خاتون تھیں۔ انہوں نے صبا کی ایک ایک بات غور سے سنی۔ جب اس کا دل ہلکا ہو گیا تو اپنے روایتی اور پر شفقت انداز میں بیٹی سے مخاطب ہوئیں۔ صبا! تم سے کس نے کہا کہ میں نے تکلیفوں میں زندگی گزاری۔ اگر نانا جان امیر آدمی تھے تو یہ میری ماں کا نصیب تھا۔ میرا نصیب تو میرے شوہر کے ساتھ جڑا تھا۔ تمہارے بابا کی آمدنی شروع میں قلیل تھی، لیکن وقت کے ساتھ ان کی محنت میں اللہ تعالیٰ نے برکتیں عطا کی تھیں، تمہاری دادی نے

اپنے بچوں کی تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، تمہارے بابا نے جو عزت اور اعتماد مجھے دیا وہی میری زندگی کا سرمایہ تھا، میں نے جو کام بھی کیا اپنے شوہر کی رضا کو سامنے رکھتے ہوئے کیا جس پر ہمیشہ ان کا اعتماد حاصل رہا۔ سسرال میں عزت ملی اور میں نے بھی ہر کام نیکی سمجھ کر کیا۔ وقت کے ساتھ پختگی آتی گئی اور کمزوریاں دور ہوتی گئیں جو تم سب بہن بھائیوں کی تربیت میں کام آئی۔

بیٹی میرا تو تجربہ ہے کہ اگر ہر ذمے داری اور ہر رشتے کو نیکی سمجھ کر نبھاؤ تو اللہ تعالیٰ بڑا خوش ہوتا ہے۔ برکت بھی ڈالتا ہے اور آسانیاں بھی پیدا کرتا ہے۔ بیٹی تمہارا شوہر تمہیں بہت عزت دیتا ہے۔ تمہاری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے سرگرم رہتا ہے۔ مالی طور پر مستحکم ہے۔ تم پر اعتبار کرتا ہے۔ بیٹی یہ عزت اور اعتبار کا رشتہ محبت سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ اگر تم رمضان میں نفلی عبادتوں کے لیے ٹائم نہیں نکال پا رہی تو تم صرف اپنی نیت کو بدلو۔ ہر کام نیکی سمجھ کر کرو۔ گھر کے کام کاج بچوں کی پرورش، مہمان داری، افطاری کرانا، سحری کا انتظام بزرگوں کا خیال ہر کام اللہ کی رضا کے لیے کرو۔ نفلی عبادات سے زیادہ انشاء اللہ اجر کی مستحق ہوگی۔ بیٹی تمہاری نند کا آنا تو سراسر رحمت ہے۔ اس نے تمہارے لیے کتنی آسانیاں پیدا کی ہوئی ہیں جو بچوں کی تربیت میں بھی کام آئیں گی۔ رہا ساس کا رویہ تو یہی تلخ و شیریں رشتوں اور رویوں کو نبھا کر ہی جنت کی امیدوار بن سکتی ہو۔

صبا کو اپنی سوچ پر شرمندگی ہو رہی تھی نفیسہ بیگم کی نصیحت نے اس کی اندرونی کیفیت کو بدل دیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی اور ہر لمحہ خدا کی عطا کردہ نعمتوں کا دل ہی دل میں شکر ادا کر رہی تھی۔ صبا وہی تھی، کام وہی تھے، صرف نیت کے بدل جانے سے رویے بھی بدل گئے اور نتائج بھی۔

سلسلہ روز وشب

ابو یحییٰ

دورہ آسٹریلیا: کچھ تاثرات

المورد آسٹریلیا کی دعوت پر 28 ستمبر 2016 تا 14 اکتوبر 2016 آسٹریلیا کا سفر ہوا۔ اس دورے میں آسٹریلیا کے پانچ بڑے اور اہم شہروں یعنی ملبورن ، سڈنی، برسبین، کینبرا اور ایڈیلیڈ میں میں خطبات دینے کے علاوہ پرتھ میں یونیورسٹی اور ویسٹرن آسٹریلیا کے سنٹر آف اسلامک اسٹیٹ اینڈ سوسائٹی کی ایک کانفرس میں مقالہ پڑھنے کا موقع ملا۔ قارئین اس سفر کی تفصیلی روداد تو میرے سفرنامے ''سیر نا تمام'' میں ہلکے پھلکے انداز اور کچھ تذکیری نکات کے ساتھ پڑھ سکیں گے، لیکن کچھ علمی اور فکری نکات ایسے ہیں جو اس سفر میں فکر وخیال کا حصہ بنے رہے۔ تاہم شاید ایک سفرنامے کی صنف کے لیے وہ موزوں نہ ہوں۔ ان میں سے بعض اہم نکات اس مضمون میں قارئین کی خدمت میں پیش ہیں۔

المورد آسٹریلیا کی ٹیم

اس سفر کا اصل محرک المورد آسٹریلیا کے روح رواں جناب ڈاکٹر ذوالفقار صاحب تھے۔ ڈاکٹر ذوالفقار صاحب سڈنی کے قیام میں میرے میزبان ہونے کے علاوہ المورد آسٹریلیا کے بانی، منتظم اعلیٰ، مدرس و معلم سب کچھ ہی تھے۔ ذاتی طور پر وہ ایک انجینئر تھے اور آسٹریلیا آ کر انھوں نے ماسٹرز اور پھر پی ایچ ڈی کر رکھا تھا۔ اس تعلیمی پس منظر سے قطع نظر وہ ایک فکری اور دینی ذوق رکھنے والی شخصیت اور زبردست دعوتی اور تنظیمی صلاحیت کے مالک تھے۔ انھوں نے نہ صرف سڈنی میں اپنے اردگرد ایک مضبوط ٹیم قائم کر رکھی ہے بلکہ آسٹریلیا کے ہر اہم شہر میں المورد کے ایسے وابستگان کا حلقہ بنا دیا جنھوں نے ہر شہر میں بہترین پروگرام آرگنائز کیے۔ ان میں

ملبورن کے عبد الشکور صاحب، ایڈیلیڈ کے عامر شیخ صاحب، کینبرا میں تنویر خان صاحب، پرتھ میں کاشف صاحب کے نام نمایاں ہیں۔ برسبین میں میرے جانے پر پہلی دفعہ حلقہ قائم ہوا جس میں ارم احتشام صاحبہ، اسماء صاحبہ، مدثر صاحب اور عمار صاحب کا نام نمایاں ہے۔ جبکہ سڈنی میں ذوالفقار صاحب کی ٹیم میں فرخ صاحب، کامران مرزا صاحب، عابد صاحب، سلیمان صاحب، خالد ادریس، بلال صاحب، عبد الوحید صاحب، بلال صاحب کے علاوہ متعدد کئی اور لوگ شامل ہیں۔ ان تمام لوگوں نے ہر جگہ اپنی محبت، تعاون اور خلوص سے کہیں اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دیا اور اس خاکسار کو یہ موقع دیا کہ اپنے رب کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچا سکے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو اس کا بہترین اجر عطا فرمائے۔

فکر فراہی کا عالمی دور

آسٹریلیا میں گزارے گئے وقت سے یہ اندازہ ہوا کہ فکر فراہی اب عالمگیر دور میں داخل ہو چکی ہے۔ المورد آسٹریلیا، جاوید صاحب کے قائم کردہ علمی اور فکری ادارے المورد کا اولین عالمی پڑاؤ تھا۔ جب جاوید صاحب ملائشیا منتقل ہو گئے تو ڈاکٹر ذوالفقار صاحب نے ان سے رابطہ کر کے ان کو دو دفعہ آسٹریلیا بلایا۔ جاوید صاحب نے کئی اہم فکری لیکچر یہیں آسٹریلیا ہی میں دیے ہیں۔ اب تو آسٹریلیا کے علاوہ امریکہ، برطانیہ، کینیڈا، انڈیا اور دیگر ممالک میں المورد کے حلقے قائم ہیں، لیکن جاوید صاحب کے فکر کو دنیا بھر میں پھیلانے میں ذوالفقار صاحب ہی کو اولیت حاصل ہے۔ جاوید صاحب کا ملک چھوڑ کر چلا جانا اہل پاکستان کے لیے تو ایک بڑی محرومی بن گئی لیکن اس کے نتیجے میں دنیا بھر کے مسلمانوں میں ان کی بات پھیل گئی۔ میرے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کی اپنی حکمت ہوتی ہے۔ وہ بہتر سمجھتا ہے کہ کون سا معاملہ کہاں ہونا چاہیے۔

اس سفر میں بیشتر وقت ڈاکٹر ذوالفقار کے ساتھ گزرا اور ان سے بہت سے اہم علمی اور فکری

موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ خاص کر ان کا فکری اور ارتقائی سفر بہت تفصیل سے زیر بحث آیا۔ یہ طویل سفر انھوں نے کئی اقساط میں مجھے سنایا۔ ان کے فکری سفر کا آغاز وہی تھا جو جاوید صاحب سے وابستہ کئی اور اہم لوگوں کا ہے یعنی ڈاکٹر اسرار صاحب۔ ڈاکٹر ذوالفقار صاحب ابتداء میں ڈاکٹر اسرار کے ساتھ فکری طور پر اور کسی حد تک عملی طور پر بھی وابستہ تھے۔ تاہم آہستہ آہستہ وہ جاوید صاحب کے خیالات سے متاثر ہوتے چلے گئے۔ یہ فکری سفر محض ایک شخص کا فکری سفر نہیں بلکہ اس امت کے فکری سفر کی بھی اہم داستان ہے، اس لیے کے پس منظر کو قارئین کے سامنے رکھنا یقیناً ان کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

غیر مسلموں کا غلبہ اور مسلمانوں کا فکری جواب

ڈاکٹر اسرار مرحوم احیائے اسلام کی اس فکر کے آخری بڑے آدمی تھے جو اسلامی دنیا پر مغرب کے غلبے کے بعد مسلمانوں کی فکری قیادت کی طرف سے پیش کی گئی۔ آج کا مسلمان اس بات کو نہیں سمجھ سکتا کہ انیسویں صدی کے ایک باشعور مسلمان پر اس وقت کیا گزری ہوگی جب اس نے یورپین اقوام کو اپنے ملکوں اور علاقوں پر قابض ہوتے دیکھا ہوگا۔ آج دنیا کے جس اقتدار پر امریکہ دو عشروں سے قابض ہے، روس نصف صدی تک رہا اور برطانیہ ایک صدی کی مدت میں فارغ ہوگیا، مسلمان اس حیثیت میں یعنی دنیا کی سول سپر پاور کے طور پر دو چار نہیں بارہ صدیوں تک فائز رہے۔ ان کی قیادت بدلتی رہی۔ عربوں کی شکل میں پہلے خلافت راشدہ، پھر بنو امیہ اور پھر بنو عباس اور عجمیوں کی شکل میں عثمانی ترک، پھر اِدھر مغل اور صفوی مگر اصل اقتدار مسلمانوں کا تھا۔ مسلمان پوری متمدن دنیا کے وسط میں چھائے ہوئے تھے۔

مگر پھر یاجوج ماجوج کا بندھ ٹوٹتا ہے۔ ابن خلدون جیسا مفکر جن لوگوں کو بالکل بے وقعت سمجھتا تھا وہ اپنے ملکوں سے اٹھے اور دنیا بھر پر چھا گئے۔ چنانچہ اس کا ردعمل مسلمانوں پر بہت

شدید ہوا۔ مگر شدت جذبات میں وہ یہ تجزیہ نہیں کرسکے کہ مسلمانوں کی یہ شکست دراصل فوجی میدان کی شکست نہیں بلکہ ایک عظیم سماجی اور فکری انقلاب کا نتیجہ ہے جو کئی صدیوں کے عمل سے یورپ میں برپا ہوا۔ پہلے پہل مسلمانوں نے پے در پے فوجی مہموں کے ذریعے سے اہل یورپ کو شکست دینا چاہی۔ 1757 کی پلاسی، 1799 میسور، 1831 بالاکوٹ اور 1857 دہلی کی شکستیں اسی جدوجہد کی یادگار ہیں۔ سراج الدولہ، حیدر علی، ٹیپو سلطان، جرنل بخت خان، سید احمد شہید جیسے حکمران، جرنل اور مصلحین کی معرکہ آرائی اس مغربی یلغار کو نہ روک سکی۔ یہ معاملہ صرف ہندوستان ہی کا نہ تھا، پورا عالم اسلام اس جدوجہد میں شریک تھا۔ لیبا میں سنیوسی تحریک اور عمر مختار، سوڈان میں مہدی سوڈانی، اور قفقاز میں امام شامل نے فرانس، اٹلی، اور روس اور دیگر یورپی اقوام کے تسلط کے خلاف بھرپور مزاحمت کی۔ مگر ہر طرف ایک ہی انجام ہوا۔

اس مکمل شکست کے بعد مسلمانوں نے فکری جدوجہد شروع کی۔ مگر اس فکری جدوجہد میں بھی اصل وجوہات پر بہت کم نظر گئی۔ زیادہ تر جذباتی باتیں اور غیر حقیقی چیزیں ہی پیش نظر رہیں۔ کبھی یہ کہا گیا کہ مسلمانوں کے بعض غداران شکستوں کے ذمہ دار ہیں۔ کبھی یہ کہا گیا کہ مسلمانوں میں جذبہ جہاد ختم ہو چکا ہے اس لیے مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ کبھی یہ کہا گیا کہ جب تک عالم اسلام کے تمام مسلمان ایک نہیں ہو جاتے ہیں ان کو فتح نہیں مل سکتی۔ مگر نہ یہ مسلمانوں کی شکست کے حقیقی اسباب تھے نہ ان باتوں سے مسلمانوں کو آزادی مل سکتی تھی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر کرم کا فیصلہ کیا اور یورپی اقوام دو عظیم جنگوں میں آپس میں ٹکرا کر اتنا کمزور ہو گئیں کہ بیرون ملک اپنا تسلط قائم رکھنا ممکن نہ رہا۔

بہرحال اس پورے پس منظر میں بیسویں صدی کے آغاز میں ابوالکلام آزاد نے حکومت الٰہیہ کا تصور پیش کیا۔ اس تصور کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے لیا اور دین کی ایک پوری تعبیر

میں بدل دیا۔ اس تعبیر کا خلاصہ یہ تھا کہ ایک ایسی ریاست کے قیام کی جدو جہد کرنا جہاں اللہ کے فرامین کو اصل حکم مانا جائے، وہ اصل دینی فریضہ ہے جو مسلمانوں پر عائد ہے۔

اب یہ تو ممکن نہیں ہے کہ مسلمانوں کے ملک پر غیر مسلموں کا غلبہ ہو اور یہ ہو جائے۔ چنانچہ اس کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ ہر جگہ مسلمانوں کا ہی اقتدار قائم ہو۔ چنانچہ اس اقتدار کی جدوجہد مسلمان کی زندگی کا نصب العین قرار پائی۔ جو بات مولانا کے فکر میں بالواسطہ نکل رہی تھی، وہ مصر میں حسن البنا اور سید قطب نے براہ راست کہہ دی۔ مسلمانوں کا غلبہ اور مغرب سے نجات یہی کرنے کا اصل کام ہے۔ چنانچہ دو صدی پہلے جو جنگ مغرب کے خلاف سیاسی جنگ کے طور پر شروع ہوئی وہ بیسوی صدی تک آتے آتے ایک مذہبی فریضہ بن گئی اور اس فریضے کی ادائیگی پر ہر مسلمان کا دین منحصر قرار پایا۔

اس خاکسار کے پیش نظر اس فکر کا کوئی تنقیدی جائزہ لینا نہیں ہے، اصل مقصد اس فکر کی تاریخ کا مختصر تعارف کرا کے یہ بتانا تھا کہ ہمارے ممدوح ڈاکٹر اسرار احمد اسی فکر کے آخری بڑے آدمی تھے۔ ان کے انتقال کے بعد اب جماعتیں رہ گئیں ہیں یا تنظیمیں، پورے عالم اسلام میں اس فکر کا کوئی بڑا آدمی اب موجود نہیں ہے۔

تعبیر کی غلطی

ڈاکٹر اسرار صاحب بیسویں صدی میں سیاسی بنیادوں پر احیائے اسلام کی فکر کے آخری بڑے آدمی تھی۔ تاہم ان کے بعد اس فکر میں کوئی بڑا آدمی نہیں پیدا ہو سکا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اس فکر کے اصل بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی جیسی بڑی شخصیت کی فکر پر عین ان کے عروج کے دور میں انھی کی جماعت سے متعلق ایک نوجوان نے ایک زبردست تنقید کر دی تھی۔ میرا اشارہ مولانا وحیدالدین خاں صاحب کی طرف ہے جنھوں نے سن ساٹھ کی دہائی کی ابتدا میں

’’تعبیر کی غلطی‘‘ نامی کتاب لکھ کر دین کی اس سیاسی تعبیر پر زبردست تنقید کی تھی اور مستند حوالوں سے یہ بتایا تھا کہ ہمارے اسلاف دین کو اس طرح نہیں سمجھتے تھے جس طرح مولانا مودودی نے سمجھا ہے۔

انھوں نے اسلاف کے حوالوں کی روشنی ہی میں نہیں بلکہ اس کے ساتھ خالص علمی اور عقلی بنیادوں پر یہ بالکل واضح کر دیا تھا کہ دین کی جس سیاسی تعبیر کو قرآن مجید کے نام پر پیش کیا جا رہا ہے، قرآن مجید ہرگز یہ بات نہیں کہہ رہا۔

اس کتاب کی موجودگی میں اب یہ بہت مشکل ہے کہ کوئی معقول آدمی اب اس فکر کو اختیار کر سکے۔ اب صرف وہی لوگ اس نقطۂ نظر کے ساتھ آتے ہیں جو اصل جذباتی انداز سے سوچتے ہیں۔ چنانچہ مغربی استعمار کا ظلم، یہود و ہنود کی سازشیں، فلسطین و کشمیر کا مسئلہ جیسی چیزوں کے تناظر میں جو لوگ دنیا کو دیکھتے ہیں وہ آج بھی یہی انداز فکر رکھتے ہیں، مگر وہ لوگ جو خالصتاً علمی انداز میں قرآن مجید کی بات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کو تھوڑی ہی دیر میں یہ سمجھ میں آجاتا ہے کہ قرآن مجید کا نقطۂ نظر ہرگز یہ نہیں کہ ہر فرد پر یہ فرض ہے کہ وہ اسلامی ریاست قائم کرنے کی جدوجہد کرے۔

تاہم مولانا مودودی نے چونکہ پاکستان میں ایک جمہوری راستہ اختیار کر لیا تھا اس لیے ان پر اور ان کی جماعت اسلامی پر عملی اعتبار سے کوئی تنقید نہیں ہو سکتی۔ یہ ان کا حق ہے کہ اپنا نقطۂ نظر لوگوں کے سامنے پیش کریں اور اگر لوگ ان کا انتخاب کر لیں تو پھر وہ اپنے نقطۂ نظر کے مطابق اقتدار میں آکر حکومت کریں۔ تاہم ڈاکٹر اسرار کا معاملہ جدا تھا۔ انھوں نے چونکہ انقلابی راستہ اختیار کر لیا جس میں آخر کار اقتدار پر زبردستی ہی قبضہ کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے سیرت النبی کی روشنی میں اپنا ایک پورا منہاج بھی بیان کیا۔

یہی وہ نقطہ نظر ہے جس پر جاوید صاحب نے بہت تنقید کی اور اول دن سے کی۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی جاوید صاحب کی شخصیت اور کام کو ہدف بنایا۔۔ ذوالفقار صاحب، اس خاکسار اور دیگر بہت سے لوگوں کا فکری سفر اسی زمانے میں شروع ہوا تھا اور نوے کی دہائی کے آغاز پر اس معرکہ آرائی کے ہم چشم دید گواہ ہیں۔

اس وقت عملی صورتحال یہ ہے کہ مولانا وحیدالدین خان کو نصف صدی اور جاوید صاحب کو ربع صدی ہو چکی ہے، مگر اس تنقید کے باوجود عوام الناس میں سیاسی تعبیر کی فکر ہی مقبول ہے۔ اس کی وجہ جیسا کہ عرض کیا کہ معروضی سیاسی حالات، مسلمانوں کا تاریخ پس منظر، مغربی غلبہ جیسی چیزیں ہیں نہ کہ کوئی فکری قوت۔ اسی لیے اس فکر میں اب کوئی بڑا آدمی موجود نہیں رہا۔ یہی کسی فکر کے زوال کا پہلا مرحلہ ہوتا ہے۔ پھر موجودہ دور میں اس فکر کے حاملین دہشت گردی کی بالواسطہ یا بلاواسطہ تائید کر کے اخلاق کے ہر پیمانے پر اپنا مقدمہ ہار چکے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ صحیح بات پر توجہ دلانے والوں کے خلاف جو بے ہودہ اور جھوٹی مہمیں چلائی گئی ہیں، اس کے بعد ممکن ہی نہیں کہ کسی کو خدا کی رحمت سے کوئی حصہ مل سکے۔ اب وقت آ چکا ہے کہ امت کی فکری امامت بدل جائے۔ امت پھر بھی نہیں مانے گی تو اس کے ساتھ وہی ہوگا جو پہلے تاتاریوں کے ہاتھ ہو چکا ہے۔

دیانت دارانہ رائے

میرا تعلق اصلاً اسی سیاسی تعبیر سے تھا۔ میں نہ وحیدالدین خان کو جانتا تھا نہ جاوید احمد صاحب غامدی کو۔ میں ذہنی طور پر مولانا مودودی سے قریب اور انھی سے متاثر تھا۔ لیکن جب یہ تنقید سامنے آئی تو دین کے بنیادی ماخذ قرآن مجید کی کسوٹی پر ہر دو آراء کو پرکھنے کی کوشش کی۔ جس کے بعد پوری دیانت داری سے یہ رائے قائم ہے اور جسے پورے اعتماد سے روزِ قیامت اللہ کے حضور بیان کر سکتا ہوں کہ دین فرد کے سامنے کسی سیاسی انقلاب کا ہدف نہیں رکھتا۔ ہاں

دین میں سیاسی احکام ضرور ہیں۔اس سے کوئی انکار نہیں۔شریعت کو فرد کی طرح اجتماعی طور پر بھی نافذ ہونا چاہیے، مگر یہ فرد کا کام نہیں کہ اس کے لیے زندگی وقف کر دے۔

قرآن مجید فرد کی نجات کو آخری درجہ میں تزکیہ نفس پر موقوف رکھتا ہے۔قرآن صاف ترین الفاظ میں کہتا ہے کہ قد افلح من تزکی۔یعنی آخرت کی کامیابی وہ پائے گا جو اپنے نفس کا تزکیہ کرے گا۔ میں نے آسٹریلیا میں جو بیشتر تقریریں کیں ان میں قرآن مجید کے ایک ایک بیان کو لے کر پورے دین سے اسے متعلق کر کے بتایا ہے کہ اس باب میں قرآن مجید کا نقطہ نظر کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ذوالفقار صاحب یہ ساری تقریریں ایک ساتھ جمع کر کے شائع کر دیں گے۔ جو لوگ تفصیل سے اس بات کو سمجھنا چاہیں وہ المورد آسٹریلیا کی ویب سائٹ یا انذار کی ویب سائٹ یا یوٹیوب چینل پر ان چیزوں کو دیکھ اور سن سکتے ہیں۔

دور جدید میں فتنہ

یہ سب چیزیں اگر علمی اور فکری دائرے میں رہتیں تو غنیمت تھا۔مگر بدقسمتی سے یہ چیزیں کچھ ایسے دائروں میں پہنچ گئیں جہاں اللہ کا غضب بھڑک اٹھتا ہے۔اس کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن مجید کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ظلم سخت ناپسند ہے۔اس ظلم کی بدترین قسم ''فتنہ'' ہے۔قرآن کی اصطلاح میں اس کا مطلب کسی کے مذہبی نقطہ نظر کی بنیاد پر اس کو اذیت دینا ہے۔ یہ معاملہ جب بنی اسرائیل نے اپنے انبیا اور مصلحین کے ساتھ کیا تو اس پر خدا کا جو غضب بڑھکا ہے اسے پڑھ کر دل دہل جاتا ہے۔

ہمارے معاشرے کی جو شاید سب سے بڑی بدقسمتی ہے وہ یہی ہے کہ یہ سارے واقعات ہمارے ہاں پیش آئے ہیں۔ جاوید صاحب اور ان کے احباب کے ساتھ وہ ظلم ہوا ہے کہ جب قیامت کے دن یہ مقدمہ اللہ کی بارگاہ میں پیش ہوگا تو نجانے کتنے لوگوں کی گرفت ہوگی۔

جاوید صاحب کے کتنے رفقا کو قتل کر دیا گیا یا ان پر قاتلانہ حملے ہوئے۔ خود ان کی اور ان کے خاندان کے لوگوں کی جان عرصے تک خطرے میں رہی۔ یہاں تک کہ جب ان کے پڑوسیوں کی جان بھی خطرے میں آ گئی تو ان کو ملک چھوڑنا پڑا۔ مسلسل دھمکیوں اور خطرات کی بنا پر ان کے ادارے المورد کو بند کرنا پڑا۔ ان کے بعض ساتھیوں کو بھی جھوٹے الزامات اور جان کے خطرات کی وجہ سے ملک اور گھر چھوڑنا پڑے۔ ان اسکالرز کے لیے حصول معاش کو مشکل بنا دیا گیا۔ ان کے بچوں کے شادی بیاہ تک کے معاملات میں رکاوٹیں ڈالی گئیں۔

جھوٹی اور بے ہودہ مہموں کا تو کوئی حساب ہی نہیں۔ کون سا الزام اور بہتان ہے جو نہیں لگا۔ انتہائی مخلص اور نیک لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان چیزوں کو بلا تحقیق آگے بڑھاتے ہیں اور ان سے پوچھا جائے کہ کبھی جاوید صاحب کو پڑھا تو کہتے ہیں اتفاق نہیں ہوا۔ جاوید صاحب پر بغیر پڑھے اور ان کی بات کو بغیر سمجھے تنقید کرنا اس دور کا سب سے بڑا مذہبی فیشن اور شہرت حاصل کرنے کا آسان ترین نسخہ ہے۔ جو پڑھتے ہیں وہ اس نیت سے کہ کوئی نہ کوئی شوشہ اٹھائیں۔ یہ سوچ بغیر کے مستشرقین یہی سارے کام قرآن و حدیث کے ساتھ کر کے قرآن، حدیث، اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف ایسی ہی بے ہودہ اور جھوٹی باتیں کرتے ہیں۔

باقی جو کچھ تحقیق و تنقید کے نام پر کیا جاتا ہے، اس کی حقیقت کو کوئی سمجھنا چاہے تو مسلمانوں کے مختلف فرقے ایک دوسرے کے خلاف جو کچھ کہتے اور لکھتے رہتے ہیں، اس کو پڑھ لے یا سن لے۔ زیادہ صاحب علم ہیں تو امام اعظم ابوحنیفہ سے لے کر امام ابن تیمیہ اور شیخ محمد بن عبد الوھاب سے لے کر مولانا مودودی کے خلاف ہونے والے پروپیگنڈا مہموں کی داستان پڑھ لیں۔ ان میں سے ہر شخص اپنے زمانے میں بلکہ بعد میں بھی عرصے تک فتنہ قرار پایا اور ایک وقت آیا کہ لوگوں نے اس کو امام مان لیا۔ یہ تو ہمارے سامنے کی بات ہے کہ ہم نے سید مودودی کو فتنہ

مودودی اور ''ایک مودودی سو یہودی'' سے مودودی رحمت اللہ علیہ میں بدلتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ جاوید صاحب کے ساتھ بھی یہی ہونا ہے۔ اِدھر وہ دنیا سے رخصت ہوں گے اور اُدھر غامدی رحمت اللہ علیہ قرار پائیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ جاوید صاحب کا تحقیقی کام اس سے کہیں زیادہ بڑا ہے، جتنا لوگ واقف ہیں۔ میرے نزدیک اس کام کی اصل قدر و قیمت دو پہلوؤں سے ہے۔ ایک یہ کہ قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو حیثیت عقیدت اور زبانی اعتراف کی سطح پر سب دیتے ہیں، مگر عملی طور پر علم کی دنیا میں کوئی دینے کو تیار نہیں، وہ حیثیت جاوید صاحب کے کام نے مسلمہ طور پر قائم کردی ہے۔ ہم قرآن و سنت کو سب سے بڑا مانتے ہیں اور اس کے بعد ایک ''لیکن'' کہہ کر عملی رویہ بالکل کچھ اور کردیتے ہیں۔ اس کی وجہ منافقت نہیں علم کی دنیا کے کچھ مسائل تھے جو جاوید صاحب اور ان کے جلیل القدر اساتذہ کے کام کے نتیجے میں حل ہو گئے۔ قرآن، سنت، حدیث اور شریعت اور ان پر کئے گئے علمی کام علمی مشمولات سے اس کی درجنوں مثالیں دی جاسکتی ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ یہ سفرنامہ ان علمی مباحث کا تحمل نہیں کرسکتا۔

اس کام کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ دین کی حجت اب دنیا کے سامنے سائنسی بنیادوں پر قائم کی جاسکتی ہے۔ خاص کر قانون اتمام حجت کے واضح ہونے کے بعد قرآن اور صاحب قرآن کی صداقت کا ایک ایسا پہلو سامنے آتا ہے جو ہر معقول انسان کو ان کے سامنے سر جھکانے پر مجبور کرتا ہے۔ اس کام کے نتیجے میں فہم قرآن، سنت اور شریعت کو سائنسی بنیادوں پر انسانی اضافوں سے الگ کرکے بیان کیا جاسکتا ہے۔ انسانی اضافوں کے الگ ہونے کے بعد ان پر ہونے والے ہر اعتراض کا معقول جواب دیا جاسکتا ہے۔

شریعت میں افراط و تفریط

جاوید صاحب کا اصل کام جو بہت کم زیر بحث آتا ہے اس کو شریعت کے حوالے سے سمجھایا جاسکتا ہے۔اسلامی شریعت اس اعتبار سے ایک معجزہ ہے کہ وہ زرعی دور کے ایک قبائلی معاشرے میں نازل ہوئی مگر تا قیامت ہر طرح کے حالات حتیٰ کہ آج کی انفارمیشن ایج میں بھی قابل عمل ہے۔

اس حوالے سے جو مسائل سامنے آتے ہیں وہ شریعت میں نہیں بلکہ مسلمان اہل علم کی طرف سے پیدا ہوئے ہیں۔ایک مسئلہ یہ ہے کہ اس وقت شریعت کے نام پر جو علمی ذخیرہ ہمارے پاس موجود ہے، اس میں خدائی شریعت اور انسانی فہم دونوں شامل ہیں۔اس بات کا پس منظر یہ ہے کہ اصل شریعت زندگی کے بہت کم معاملات میں مداخلت کرتی ہے۔مگر انسانی زندگی کا دائرہ بہت وسیع ہے۔چنانچہ اس دائرے میں جب سوالات پیدا ہوئے تو ہمارے جلیل القدر فقہا نے اپنے حالات اور ماحول کے لحاظ سے ان کے جواب دیے اور اپنی آراء بیان کیں۔جس کے بعد ہمارا فقہی ذخیرہ وجود میں آیا۔یہ فقہی ذخیرہ جو اصلاً انسانی فہم پر مشتمل تھا رفتہ رفتہ ابدی شریعت کا حصہ سمجھا جانے لگا۔یہ فقہی ذخیرہ بڑا غیر معمولی ہے، مگر زرعی دور میں بنایا گیا تھا اور سب سے بڑھ کر انسانوں نے اپنے حالات کو سامنے رکھ کر بنایا تھا۔چنانچہ یہ شریعت کی طرح کبھی ابدی نہیں ہوسکتا۔چنانچہ صنعتی دور اور اب انفارمیشن ایج کے بعد ان میں بہت سی چیزیں بالکل غیر متعلق یا غیر عملی ہوچکی ہیں۔جب ان کو مقدس سمجھ کر دین کے نام پر پیش کیا جاتا ہے تو اس کے سنگین نتائج نکلتے ہیں۔آج بھی بہت سے لوگ اور آنے والے دنوں میں تمام مسلمانوں کی نئی نسلوں کے لیے اس طرح کی کوئی پابندی قابل قبول نہیں رہے گی۔اس بات کو سمجھنا ہے تو اس ایک مثال سے سمجھیں کہ ہزار سال تک حرام سمجھی جانے والی تصویر آج حلال ہوچکی ہے۔ایک نسل پہلے تک تصویر کی مخالفت کرنے والے اب اس تمدن کا مکمل حصہ ہیں جو تصویر پر کھڑا ہوا

ہے۔ جو گنتی کے لوگ رہ گئے ہیں وہ اگلی نسل تک اس کا حصہ بن چکے ہوں گے۔

اہل علم کے ایک اور گروہ سے یہ غلطی ہوئی کہ انھوں نے جب عصر حاضر میں شریعت کے اوپر وارد ہونے والے بعض سوالات کو دیکھا تو اس مسئلے کا یہ حل نکالا کہ ان خاص احکام کے پہلو سے شریعت کو عملی طور معطل یا غیر متعلق کر دیا جائے۔ یہ بھی ایک علمی غلطی ہے جو نیک نیتی سے کی جارہی ہے۔مگر یہ کم وبیش وہی غلطی ہے جو سینٹ پال نے کی تھی۔یعنی شریعت صرف یہودیوں کے لیے ہے۔ ہمارے ہاں شریعت کو اُس دور کے عرب کے لیے خاص کیا جارہا ہے جب قرآن نازل ہوا تھا۔یا پھر امام کے اجتہاد، مقاصد شریعت وغیرہ کی تاویل کے ذریعے سے عملاً شریعت کو بعض جگہوں پر معطل کرنے کا عمل شروع ہو چکا ہے۔

یہ دونوں رویے افراط وتفریط ہیں۔اس معاملے میں جاوید صاحب کا شریعت پر کام ایک بڑا غیر معمولی کام ہے۔ انھوں نے صدیوں سے انسانی اضافوں میں دبی اصل شریعت کو قرآن، سنت اور احادیث کی روشنی میں سامنے رکھ دیا ہے۔ بد قسمتی سے ان کا یہ عظیم کام ان کی وجہ شہرت نہیں بن سکا۔ان کی وجہ شہرت ان کی بعض فقہی آراء بن گئیں ہیں۔ان کے معتقدین اور مخالفین دونوں ان کی بنیاد پر ان کے کام کا تعین کرتے ہیں۔حالانکہ ان کا اصل کام جس کی بنا پر تاریخ میں وہ یادرکھے جائیں گے وہ ہے جو انھوں نے شریعت پر کیا ہے اور ان کی کتاب ''میزان'' کا حصہ ہے۔اہل علم فتویٰ بازی سے فارغ ہو جائیں تو کبھی اِس حیثیت میں ان کے کام کا مطالعہ کریں۔ اس کام نے اس چیلنج کا جواب بڑی حد تک دے دیا ہے کہ جو اگلے بیس پچیس برسوں میں پورے عالم اسلام کے لیے ایک عظیم مسئلہ بن جائے گا۔

فکر فراہی

جاوید صاحب کا یہ کام تنہا ان ہی کا کام نہیں بلکہ اس کے پیچھے ان کے اساتذہ امام حمید الدین

فراہی اور اصلاحی صاحب کی بلند پایہ شخصیات کھڑی ہیں۔امام فراہی کے پس منظر ہی میں جاوید صاحب اسے فکر فراہی قرار دیتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ فکر اصلاً اس چیز کے بیان کا نام ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کتاب اپنے پیچھے خود چھوڑ گئے ہیں اور جو تمام فکری معاملات میں آخری حجت ہے وہ قرآن مجید ہے۔دین کے نام پر موجود ہر چیز پر قرآن مجید کی برتری جواب رہتی دنیا تک خدا اور اس کے رسول کے قائم مقام ہے، یہی فکر فراہی ہے۔یہی اس کا اصل اصول ہے۔یہی اس فکر کا لایا ہوا اصل انقلاب ہے۔یہ کام اصلاً امام فراہی نے کیا تھا اور ہر دوسری چیز پر قرآن مجید کی برتری کو عملاً ثابت کر دیا تھا۔

علم کی دنیا میں جب اس قدر بلند پایہ شخصیات پیدا ہو جائیں تو اس کے بعد علمی انقلاب آیا ہی کرتے ہیں۔تاہم اکثر یہ انقلاب شخصیات کے گزرنے کے بعد آتے ہیں۔ان کی زندگی میں تو ایسے لوگ کفر و ضلالت کے فتووں اور مخالفتوں کے طوفان میں گھر کر اجنبی بنے رہتے ہیں۔اسی پس منظر میں فراہی صاحب نے اپنے خلاف ایک فتوے کے جواب میں کہا تھا کہ یہ فتویٰ دینے والے مجھے نہیں جانتے۔

شخصیت پرستی

مگر ایک دوسرا مسئلہ بھی ایسی شخصیات کے بعد پیدا ہو جاتا ہے۔وہ شخصیت پرستی کا مسئلہ ہے۔انسانوں کا المیہ یہ ہے کہ اکثر وہ دو انتہاؤں پر ہی رہتے ہیں۔یا تو نری مخالفت یا پھر نری عقیدت، بیچ کی راہ پر رہنے والے لوگ کم ہی ہوتے ہیں۔جاوید صاحب کی ایک بڑی علمی خدمت یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے ساتھ رہنے والوں کو اختلاف رائے کرنے کی اجازت دی ہے اور وہ کبھی اس سے بے مزہ نہیں ہوتے۔

تاہم عام لوگوں کا شاید کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔وہ ہمیشہ عقیدت کی عالیشان عمارت بلند کرتے

ہیں اور آخرکار اسے اپنے ممدوح کا مزار بنا کر قبر پرستی شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ایک دوسرا قبرستان بھی بناتے ہیں اور اس میں ہر اختلاف کرنے والے کو بھی دفن کر دیتے ہیں۔ یہ انسانوں کا المیہ ہے۔ اس سے بلند صرف وہی لوگ ہوتے ہیں جن کے لیے عظمت کا سرچشمہ صرف خدائے لم یزل کی ذات بلند ہوتی ہے۔ ان کے لیے خطا سے پاک صرف انبیا علھیم السلام ہوتے ہیں اور جن کے لیے دین کا ماخذ و محور صرف خاتم الانبیا والمرسلین کی ہستی ہوتی ہے۔ جن کے لیے ذاتی عقیدت سے زیادہ دلیل طاقتور ہوتی ہے۔ مگر اس طرح کے لوگ کم ہی ہوتے ہیں۔

کچھ اور مسائل

شخصیت پرستی پہلی چیز ہے جو کسی بھی فکر کے لیے تباہ کن ہوتی ہے۔ یہ تباہی عام طور پر کسی فکر کے آخر کے زمانے کے لوگوں کے ہاتھوں آتی ہے۔ جاوید صاحب کی فکر کو بھی اب معاشرے میں بہت قبول عام ہو گیا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ بڑھتا چلا جائے گا۔ مگر بعد میں آنے والے کچھ اور خرابیاں بھی اپنے ساتھ لیتے آرہے ہیں۔ ان پر بھی توجہ دلانا ضروری ہے۔

فکر فراہی اصلاً ایک علمی تحریک ہے جس کی بنیاد تطہیر افکار پر ہے۔ فطری طور پر اس کا زیادہ زور علمی اور فکری مباحث پر ہے۔ جو لوگ مانوس ہوتے ہیں، ان کا پس منظر یہی ہوتا ہے۔ لیکن دین کی دعوت اپنی حقیقت اور مقصد کے لحاظ سے اول تا آخر ایک اخلاقی دعوت ہے۔ علمی معاملات میں ایک شخص جب اپنے تعصّبات سے اوپر اٹھ جائے تو اس کے بعد کسی چیز کا سمجھنا مسئلہ نہیں رہتا۔ جبکہ اخلاقی معاملات کی اصلاح میں برسوں لگ جاتے ہیں۔ بلکہ بارہا تو لوگوں کو اپنی کمزوریوں کا نہ علم ہو پاتا ہے نہ وہ ان کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ علم ہو بھی جائے تو ان کی اصلاح بہت مشکل کام ہے۔ چنانچہ جو لوگ اس فکر سے وابستہ ہوتے ہیں، ان میں اکثر وہی اخلاقی کمزوریاں موجود رہتی ہیں جو پہلے سے تھیں۔ جس کے بعد اللہ کے ہاں جوابدہی

زیادہ ہونے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔اس لیے کہ فکر کی تطہیر ہوجائے اور علم کی نہ ہو تو انسان کی زیادہ پکڑ ہوگی۔یہ وہ چیز ہے جس کی بڑی اصلاح کی ضرورت ہے۔

فکری مباحث میں ہمہ وقت لگے رہنے کا ایک نقصان یہ ہے کہ یہ انسان میں جا بے جا تنقید اور بعض اوقات دوسروں کی تضحیک کا رجحان پیدا کردیتے ہیں۔بدقسمتی سے اس فکر کے کچھ نئے وابستگان میں یہ رجحان نظر آتا ہے۔جبکہ ایک بندہ مومن کے دل میں دوسروں کی خیر خواہی کا جذبہ ہونا چاہیے۔کسی کی علمی رائے کے دلائل کتنے بھی کمزور محسوس ہوں، ہمیشہ اس احساس میں جینا چاہیے کہ ہوسکتا دوسرا شخص ہی ٹھیک ہو۔ایسے میں اپنی بات دلائل سے بیان کر کے خاموش ہوجانا ہی مناسب طریقہ ہے۔دوسروں کو شکست دے کر زمین ہی پر گرا دینا کوئی درست طریقہ نہیں۔

اس فکر کے اہل علم عام طور پر ظواہر پرستی پر تنقید کرتے ہیں۔تاہم اس سے بعض وابستگان میں یہ تصور پیدا ہوجاتا ہے کہ ہر ظاہری حکم غیر مطلوب ہے۔اسی طرح یہ اہل علم بعض ان چیزوں کے جواز کے قائل ہیں جن میں عام اہل مذہب بہت سختی سے قائل ہیں۔چنانچہ اس فکر کے وابستگان ان رعایتوں اور اجازتوں سے فائدہ اٹھاتے اٹھاتے ، ان سرحدوں میں قدم رکھتے ہیں جو بہر مال ممنوعات کے دائرے میں آتی ہیں۔خاص کر وہ احکام جو سد ذریعہ کے نوعیت کے ہیں۔اسی طرح نوافل اور ذکر الٰہی کی مدد سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک گہرا تعلق خود اپنی جگہ ایک بڑی غیر معمولی اور مطلوب صفت ہے۔وہ بھی اجازتوں اور رعایتوں میں کہیں اِدھر اُدھر ہوجاتی ہے۔

ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ فکر فراہی کے ساتھ ابتداءً وہی ہوا ہے جو کسی بھی بڑی اصلاحی تحریک کے ساتھ ہوتا ہے۔یعنی زبردست مخالفت اور جھوٹا پروپیگنڈا۔اس کے وابستگان میں اس کا ردعمل پیدا ہونا ایک فطری چیز ہے۔بعض لوگوں میں یہ ردعمل بڑھتا ہے اور مذہبی طبقے کے عناد اور مخالفت میں بدل جاتا ہے۔ بہت سے لوگ پہلے ہی سے ''مولوی دشمن'' ہوتے ہیں۔ان کو اس

فکر کے اہل علم کی صورت ایک گھونسا مل جاتا ہے جسے وہ اپنی دانست میں مولویوں کی ناک توڑنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جس سے بعض صالح طبیعت لوگ بھی متنفر ہوجاتے ہیں، حالانکہ ان کو کوئی فکری اور علمی اشکال نہیں ہوتا۔

اس فکر کا ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ اس کے متعلقین یہ جاننے کے باوجود کہ دین کی اہم اور بنیادی چیزیں کیا ہیں، ان کو زیر بحث لانے کے بجائے ثانوی چیزوں کو بار ہا اپنی گفتگو کا موضوع بنا لیتے ہیں۔ ثانوی درجے کی چیزیں زیر بحث لانے کے بعد اہم ترین چیزیں کہیں پس پشت چلی جاتی ہیں۔ جس کے بعد دین کا اصل نقطہ نظر واضح ہونے کے بجائے غیر اہم چیزیں ہی موضوع بحث بن جاتی ہیں۔

اگر جنگ شیطان سے ہے تو

یہ خاکسار علم کی جدید اور قدیم دنیا کے مسائل سے واقف ہے۔ یہ عاجز اصلاً قدامت پسند شخص ہے۔ یہ جانتا ہے کہ دور جدید میں نئے علمی، فکری اور تہذیبی چیلنج اتنے بڑے ہیں کہ قرآن مجید کے علاوہ مسلمانوں کے پاس کوئی ڈیفنس لائن نہیں ہے۔ علمی طور پر قرآن مجید کی بنیاد پر یہ ڈیفینس لائن فکر فراہی نے دے دی ہے۔ آج مخالفت اور عناد کی فضا میں شاید لوگوں کو یہ بات سمجھ نہ آئے۔ مگر پچیس سال بعد بیشتر انصاف پسند لوگوں کو یہ بات سمجھ آ چکی ہوگی۔

اس فکر کا اصل چیلنج اس کے مخالفین نہیں۔ انھیں تو ہر حال میں ہارنا ہی ہے۔ اس فکر کا اصل چیلنج وہ کمزوریاں ہیں جو اس خاکسار نے اوپر گنوائی ہیں۔ یہ کمزوریاں باقی رہیں تو شیطان اپنی جنگ یہاں سے نہ سہی وہاں سے جیت جائے گا۔ جنگ اگر شیطان سے ہے تو پھر ان کمزوریوں کی اصلاح ہونا اس وقت فکر فراہی کا سب سے بڑا مسئلہ بن جانا چاہیے۔

ابویحییٰ

مضامین قرآن (36)

دعوت کا ابلاغ

مضامین قرآن کے اس سلسلے میں ہم نے دعوت کے دلائل کے بعد دعوت دین اور اس کے ردوقبول کے نتائج پر گفتگو شروع کی تھی۔ اس سلسلے کا پہلا موضوع دین کی بنیادی دعوت تھا جس کے ذیل میں ہم نے دعوت عبادت رب، تعارف رب، اور سنن الٰہی وغیرہ کا مطالعہ کیا تھا۔ دین کی بنیادی دعوت کے بعد دوسرا موضوع دعوت کا ابلاغ ہے۔ اس میں پہلی چیز جو ہم زیر بحث لائیں گے وہ فطرت کی وہ رہنمائی ہے جو ہر انسان میں ودیعت کردی گئی ہے۔

فطرت کا الہام

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو خیر وشر کے جس اخلاقی امتحان میں اتارا ہے اس کی بنیادی اساس اس حقیقت پر رکھی گئی ہے کہ بنی نوع انسان اپنی فطرت میں جانوروں سے بالکل جدا ہے۔ جانور اپنی جبلتوں سے بلند کوئی شعور نہیں رکھتے۔ بھوک پیاس، افزائش نسل اور اپنی بقا کی جنگ سے اوپر اٹھ کر جانور اخلاقی بنیادوں پر کسی حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ اس کے برعکس انسان جانتے ہیں کہ ظلم، حق تلفی، ناانصافی، دھوکہ دہی بری چیز ہے۔ امانت ودیانت، صدق وسچائی، عدل وانصاف، رحم اور ہمدردی اعلیٰ اوصاف ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان روز ازل سے اپنے اندر فطرت کا وہ الہام لے کر اس دنیا میں آیا ہے جسے قرآن مجید جگہ جگہ سیدھی اور روشن راہ کہتا ہے۔ یہ وہ اخلاقی اصول ہیں جن کی پابندی ہر دور میں لوگ کرتے آئے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ لوگ ان اخلاقی اصولوں کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔ بہت لوگ کرتے

ہیں اور ہر دور میں کرتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا کرنے سے بہت سے مادی فوائد حاصل کیے جاسکتے ہیں۔لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد بغیر کسی خارجی دباؤ کے ان اخلاقی اصولوں کو اچھا سمجھ کر اختیار کرتی ہے اور رذائل کو برا سمجھ کر ترک کرتی ہے۔ جو لوگ ان اخلاقی اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں وہ بھی ان کے کرنے کو برائی سمجھتے ہیں۔کسی کی اخلاقی حس بالکل مردہ ہو جائے تب بھی جس لمحے اس کے ساتھ اخلاقی بنیادوں کو پامال کر کے برا معاملہ کیا جاتا ہے، اسے احساس ہو جاتا ہے کہ ایسا کرنا بالکل غلط ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان چیزوں کا منبع و ماخذ مذہب نہیں ہے۔گرچہ مذہب ان کی چیزوں کی تائید و تصدیق کرتا ہے بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر وہ اپنی دعوت کو جس بنیاد پر پیش کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کی دعوت مسلمہ اخلاقی اصولوں پر پوری اترتی ہے۔تاہم یہ اخلاقی اصول مذہب سے ہٹ کر اپنا ایک وجود رکھتے ہیں اور اپنی بقا کے لیے مذہب کے محتاج نہیں۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جن اقوام میں صدیوں بلکہ ہزاروں برس سے کوئی رسول یا نبی نہیں آیا اور نہ ان میں کوئی الہامی کتاب پائی جاتی ہے، ان کے ہاں بھی یہ سارے اخلاقی تصورات اسی طرح جانے اور مانے جاتے ہیں۔

یہی وہ پس منظر ہے جس میں قرآن مجید بار بار اس بات کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خیر و شر کے یہ تصورات نفس انسانی میں اول دن ہی سے ودیعت کر دیے ہیں اور انسان اپنے ضمیر کی عدالت میں ہر روز پیش ہو کر اپنا محاسبہ کر سکتا ہے اور انسان اس آئینے میں اپنا چہرہ خوب پہچانتا ہے۔چاہے زبان سے وہ کچھ بھی کہے۔

اس ضمن کی ایک اور اہم بات یہ ہے کہ ان اخلاقی تصورات کا تعلق انسانوں کے باہمی معاملات ہی سے نہیں بلکہ وجود خداوندی اور خدا کی توحید یعنی ایک خدا کا تصور بھی اس میں شامل

ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں آنے سے قبل ایک روز تمام انسانوں کو پیدا کر کے ان کو اپنی ہستی اور اپنی توحید کا بھرپور شعور دیا تھا۔ قرآن مجید اس کو بھی واضح کرتا ہے کہ یہی توحید کا وہ تصور تھا جس کو شیطان نے اول دن سے اپنا ہدف بنایا اور اسی لیے انسانیت سب سے بڑھ کر توحید ہی کے معاملے میں راہ راست سے بھٹکتی رہی ہے۔ صرف توحید ہی نہیں بلکہ انسانی فطرت آخرت پر بھی بھرپور گواہی دیتی ہے۔ قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ تمام انبیا کی دعوت اسی فطرت پر ہوتی ہے۔ فطرت کی یہ پکار اتنی واضح ہوتی ہے کہ کئی مقامات پر قرآن مجید میں اسے ''بیـــنة''، (مثلاً دیکھیے ہود 28:11) یعنی روشن دلیل قرار دیا گیا ہے۔ ان چیزوں پر ہم دلائل کے ضمن میں بہت تفصیل سے بات کر چکے ہیں اور وہاں ہم نے یہ بتایا تھا کہ کس طرح انسانی فطرت وجود باری تعالیٰ، توحید باری تعالیٰ اور روز قیامت پر گواہ ہے۔

قرآنی بیانات

''قسم ہے نفس انسانی کی اور جیسا کہ اسے ٹھیک بنایا۔ پھر اس کی بدی اور تقویٰ اسے الہام کیا، کامیاب ہوا وہ جس نے اس نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا جس نے اسے آلودہ کر دیا۔''،

(الشمس 91:7-10)

ہم نے اس (انسان) کو راہ سجھا دی۔ چاہے وہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا،

(الدھر 76:3)

''(کیا ہم نے) دونوں راستوں کی طرف اس (انسان) کی رہنمائی نہیں کی''،

(البلد 90:10)

''اور یاد کرو، جب تمھارے پروردگار نے بنی آدم کی پشتوں سے اُن کی اولاد کو نکالا اور اُنھیں خود اُن کے اوپر گواہ بنا کر پوچھا: کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ اُنھوں نے جواب دیا: ضرور، آپ ہی ہمارے رب ہیں، ہم اِس پر گواہی دیتے ہیں۔ یہ ہم نے اِس لیے کیا کہ کہیں تم قیامت کے دن یہ نہ کہہ دو کہ ہم تو اِس سے بے خبر ہی تھے یا اپنا عذر پیش کرو کہ شرک کی ابتدا تو

ہمارے باپ دادانے پہلے سے کررکھی تھی اور ہم بعد کواُن کی اولاد ہوئے ہیں، پھر آپ کیا اِن غلط کاروں کے عمل کی پاداش میں ہمیں ہلاک کریں گے؟ ہم اِسی طرح اپنی آیتوں کی تفصیل کرتے ہیں، (اِس لیے کہ لوگوں پر حجت قائم ہو) اور اِس لیے کہ وہ رجوع کریں۔''

(الاعراف 7:174-172)

''(یہ قیامت کو جھٹلاتے ہیں)؟ نہیں (وہ تو ہو کر رہے گی اور اس کے لیے)، میں قیامت کے دن کو گواہی میں پیش کرتا ہوں اور نہیں (یہ کیسے جھٹلا سکتے ہیں) میں (ان کے اندر) ملامت کرنے والے نفس کو گواہی میں پیش کرتا ہوں۔''، (القیامہ 75:2-1)

''اور ہم نے تمہارا خاکہ بنایا، پھر تمہاری صورت گری کی، پھر فرشتوں کو فرمایا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، وہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔ فرمایا کہ جب میں نے تجھے حکم دیا تو تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا؟ بولا میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے پیدا کیا۔ فرمایا، پھر تو یہاں سے اتر، تجھے یہ حق نہیں ہے کہ تو اس میں گھمنڈ کرے، تو نکل، یقیناً تو ذلیلوں میں سے ہے۔ بولا، اس دن تک کے لیے تو مجھے مہلت دے دے جس دن لوگ اٹھائے جائیں گے، فرمایا، تو مہلت دے دیا گیا۔ بولا، چونکہ تو نے مجھے گمراہی میں ڈالا ہے اس وجہ سے میں تیری سیدھی راہ پر ان کے لیے گھات میں بیٹھوں گا، پھر میں ان کے آگے، ان کے پیچھے، ان کے داہنے اور ان کے بائیں سے ان پر تاخت کروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا۔ فرمایا، تو یہاں سے نکل خوار اور راندہ۔ ان میں سے جو تیری پیروی کریں گے تو میں تم سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔''، (سورۃ اعراف 7 :18-11)

''پس تم اپنا رخ یکسو ہو کر دینِ حنیف کی طرف کرو۔ اس دینِ فطرت کی پیروی کرو جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا۔ اللہ کی بنائی ہوئی فطرت کو تبدیل کرنا جائز نہیں ہے۔ یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اسی کی طرف متوجہ ہو کر اور اسی سے ڈرو اور نماز کا اہتمام رکھو۔ اور تم لوگ مشرکین میں سے نہ بنو''، (سورہ روم آیات 30: 31-30)

سید اسرار احمدؒ

آؤ روئیں

آؤ روئیں اور خوب روئیں اس بات پر نہیں کہ ہماری خواہشات پوری کیوں نہیں ہوتیں، بلکہ اس لیے کہ ہم اپنی خواہشات کے کیسے غلام ہیں!!!

برما و فلسطین ہوں یا شام و عراق، نیل کے ساحل سے تا بخاکِ کاشغر ہماری ماؤں اور بہنوں کی آہ و فغاں سے دھرتی لرزتی رہی، ہمارے جوانوں کی لاشوں کو درندے بھنبھوڑتے رہے، لیکن ابابیلیں اتریں نا آسمان نے خاموشی کا قفل توڑا، آؤ روئیں اور خوب روئیں، اس بات پر نہیں کہ امت پر ظلم و ستم کی سیاہ رات ختم کیوں نہیں ہوتی، بلکہ اس لیے کہ ڈیڑھ ارب کی مسلم آبادی میں کوئی سے دو ہاتھ بھی ایسے نہیں کہ جو دعا کے لیے اٹھیں تو اللہ انہیں خالی ہاتھ نہ لوٹائے!!!

آؤ روئیں اور خوب روئیں، اس بات پر نہیں کہ ہمارا مظلوم ہونا اللہ پر ثابت کیوں نہیں ہوتا، بلکہ اس بات پر کہ ہمارا ظالم ہونا خود ہم پر ثابت نہیں ہوتا، ہم ایسے الفاظ کے ماہر بن چکے ہیں جو ہمارے ہاتھوں ہمارے ہی معاشروں میں پھیلے ظلم و فساد کے گورکھ دھندے کو عین حق و انصاف کا روپ دے سکیں!!!

آؤ روئیں اور خوب روئیں، اس بات پر نہیں کہ ہماری قومی خدمت رنگ کیوں نہیں لاتی، بلکہ اس بات پر کہ ہم نے اپنی شخصی لوٹ مار کو قومی خدمت کا خوبصورت عنوان دے رکھا ھے!!!

آؤ روئیں اور خوب روئیں، اس بات پر نہیں کہ ہماری بے گناہی پر بھی دکھ و آلام ہمارا نصیب کیوں بنتے ہیں، بلکہ اس لیے کہ ہم میں سے ہر آدمی کو ایسے قانونی نکتے ہاتھ آ گئے ہیں جو ہمارے جرائم کو بے گناہی کا سٹیفکیٹ عطا کر دیتے ہیں!!!

آؤ روئیں اور خوب روئیں۔ اس بات پر نہیں کہ دنیا دار اور بے دین لوگوں کے ہاتھ قیادت

کیوں اور کیسے آ گئی، بلکہ اس بات پر کہ ہم نے فضائل و مسائل کا وہ انبار جمع کر رکھا ہے جو ہماری بے دینی کو دینی کمال کا شاندار کریڈٹ دے دیتا ہے!!!

آ ؤ روئیں اور خوب روئیں، اس بات پر نہیں کہ ہم باریک بیں و نکتہ چیں، دوسروں کی ہر بڑی اور چھوٹی غلطی کی تشہیر کو اپنا نصب العین بناتے رہے اور پھر بھی وہ بجائے نقصان اٹھانے کے اللہ کے خزانوں میں حصہ دار بنتے رہے، بلکہ اس بات پر کہ ہم دوسروں کے مچھر چھاننے کے ماہر بنے اور اپنے سموچے اونٹ نگل گئے!!!!

آ ؤ روئیں اور خوب روئیں، اس بات پر نہیں کہ ہم چوکوں اور شاہراہوں پر اللہ و رسول کے نام کے ڈنکے بجاتے رہے پھر بھی تبدیلی کی ہوائیں نہ چل سکیں، بلکہ اس لیے کہ ہم نے اپنی تنہائیوں میں پاکبازی کے رسمی چوغے اتار پھینکے اور نہاں خانہ دل کو خدا کی خشیت و انابت اور تعلق مع اللہ سے مزین نہیں کیا!!!

آ ؤ روئیں اور خوب روئیں، اس بات پر نہیں کہ ہم کافروں کی بربادی کی بددعائیں کرتے رہے اور وہ تہہ در تہہ نعمتوں کی فراوانیوں سے لطف اندوز ہوتے رہے، بلکہ اس بات پر کہ ہم نے انہیں خیر خواہی اور محبت سے اللہ کا پیغام نہیں پہنچایا، اور انہیں نفرت و حقارت سے دھتکارتے رہے!!!

آ ؤ روئیں اور خوب روئیں، اس بات پر نہیں کہ آخری رسول کے امتی ہو کر بھی دنیا میں ذلت و رسوائی ہمارا مقدر کیوں بنی، بلکہ اس لیے کہ ہم نے امتی ہونے کا پاس نہ رکھا اور تمام تر بداعمالیوں اور سر سے پاؤں تک گناہوں میں لتھڑے ہو کر بھی پیغمبر عالی مقام کو اپنا یقینی سفارشی سمجھا!!!

آ ؤ روئیں اور خوب روئیں، اس بات پر نہیں کہ جلسوں اور کانفرنسوں میں دھواں دھار تقریریں ہمارا شاندار ماضی لوٹانے میں ناکام و نامراد رہیں، بلکہ اس لیے کہ ہم اپنی بے عملی اور

خود فریبی کو عمل کا شاندار کریڈٹ دیتے رہے!!!

آؤ روئیں اور خوب روئیں، اس بات پر نہیں کہ ہم فقہی مسائل اور ظواہر کے اہتمام میں دن رات گھلتے رہے اور پھر بھی عبادتیں حبط اعمال کا شکار ہوئیں، بلکہ اس لیے کہ اپنی نماز و عبادات کے ساتھ حسد و کبر، حج و عمروں کیساتھ عجب و ریا اور روزہ و زکوٰۃ کے ساتھ جھوٹ و ظلم جمع کرتے رہے!!!

آؤ روئیں اور خوب روئیں، اس بات پر نہیں کہ جنت کا یقین رکھ کر بھی دنیا ہمارے لیے جہنم بنی رہی، بلکہ اس لیے کہ جنت کا باسی ہونے کی کوئی جھلک ہمارے کردار و گفتار سے ظاہر نہیں ہو سکی!!!

آؤ روئیں اور خوب روئیں، اس لیے نہیں کہ دین و مذہب کے عنوان سے مجلسیں، خانقاہیں اور بیٹھکیں سجا کر بھی خیر کی کوئی رمق نہ مل سکی، بلکہ اس لیے کہ ہم نے دین کو محض بحث و مباحثے کا عنوان بنائے رکھا اور عمل سے بے بہرہ رہے!!!

آؤ کہ آج اپنے حال پر رولیں قبل اس کے کہ رونے پر مجبور کر دیئے جائیں، آج امتحان کی آزادی ہے، آج موقعہ ہے کہ جو چاہے فریب دیتے پھریں، مگر جب امتحان کی مدت ختم ہوگی تو ہم اپنے آپ کو بالکل بے بس پائیں گے۔ وہ دن کہ جب لکھے ہوئے طومار لپیٹ کر رکھ دیے جائیں گے، اور ہم سب پر سے فریب کا یہ پردہ اور نمائشی تقوے کا یہ لباس اتر چکا ہوگا جس کو ہم آج پہنے ہوئے ہیں، ہم میں سے ہر شخص اپنی اصل صورت میں نمایاں ہو جائے گا جو فی الواقع ہماری ہے، مگر امتحان کی آزادی سے فائدہ اٹھا کر آج ہم اس کو چھپائے ہوئے ہیں۔

ہماری یہ اصل صورت اللہ کے سامنے آج بھی عریاں و برہنہ ہے مگر آخرت کی دنیا میں وہ تمام لوگوں کے سامنے نمایاں ہو جائے گی،

آؤ کہ اپنا احتساب آج کر لیں، آؤ کہ دعوت الی اللہ کو اپنا نصب العین کر لیں!!!

مبشر نذیر

ترکی کا سفرنامہ (40)

ان کی کئی تحریروں کا ترجمہ جرمن ، روسی ، البانوی ، جاپانی ، انڈونیشیائی ، ہسپانوی اور اردو زبانوں میں بھی ہو چکا ہے۔ گولان کی تحریروں کو ان کی ویب سائٹ www.fgulen.com پر دیکھا جا سکتا ہے۔

آئل چینج کا مسئلہ

طویل سفر کے بعد آئل چینج کرنا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے ایک سروس اسٹیشن پر گاڑی روکی اور بونٹ اٹھا کر وہاں موجود اسٹاف کو آئل چینج کرنے کے لئے کہا۔ یہ صاحب برٹش پٹرولیم کے تیل کی بوتل اٹھا لائے اور انجن میں موجود تیل نکالے بغیر اسے گاڑی میں ڈالنے لگے۔ میں نے مداخلت کی اور پہلے پرانا تیل نکالنے کے لئے کہا لیکن ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آ سکی۔ یہ اپنے ایک دوست کو بلا لائے جو کچھ کچھ انگریزی جانتے تھے۔ انہیں بمشکل بات سمجھائی اور انہوں نے بمشکل دوسرے کو یہی بات سمجھائی۔ کہنے لگے، ہمارے پاس نیچے سے نٹ کھولنے کا سامان نہیں ہے۔ دوسرے اسٹیشن پر گئے تو وہاں بھی یہی مسئلہ سامنے آیا۔

مجھے یاد آیا کہ رات شہر میں داخل ہوتے وقت راستے میں ایک جگہ بہت سی ورکشاپس دیکھی تھیں۔ اب ہم وہاں کی طرف روانہ ہوئے۔ ایک مکینک کو آئل چینج کا کہا تو انہوں نے ایگزان موبل، شیل، کالٹیکس اور برٹش پٹرولیم کے تیل کے ڈبے سامنے رکھ دیے اور پوچھا: " کون سا۔" میں نے ایک کا انتخاب کیا۔ یہ صاحب بھی اسی طرح بغیر پرانا تیل نکالے انجن کا ڈھکنا کھولنے لگے۔ اب میں نے تقریباً رقص کرتے ہوئے اشاروں سے بات انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ خدا کا شکر ہے کہ بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔ انہوں نے ساتھ والی ورکشاپ پر آنے کو کہا۔ یہاں زمین میں باقاعدہ خندق کھدی ہوئی تھی۔ ان صاحب نے نیچے اتر کر نٹ کھولا اور پرانا تیل نکالا۔

اس کے بعد نیا تیل ڈال کر فلٹر تبدیل کیا۔ مجھے ان کی صفائی پر حیرت ہو رہی تھی۔ ہمارے مکینک حضرات تو رات کو گھر جاتے ہوئے ہی ہاتھ دھوتے ہیں جبکہ یہ صاحب ہر دو منٹ بعد مخصوص لیکوڈ ہاتھوں پر مل کر ہاتھ دھو رہے تھے۔ اب ہم "ڈوغو بایزید" جانے کے لئے تیار تھے۔

روم و ایران کی جنگ

اب ہم ارض روم سے ایران جانے والی سڑک پر رواں دواں تھے۔ قدیم دور میں یہ پورا علاقہ " آرمینیا" کہلاتا تھا جس میں موجودہ ترکی کا تقریباً پورا مشرقی علاقہ شامل تھا۔ موجودہ دور میں آرمینیا ایک الگ ملک ہے جو اسی علاقے میں ترکی کے مشرق میں واقع ہے۔ آرمینیا پر بھی 1991ء تک روس نے قبضہ جمایا ہوا تھا۔ آرمینیا سے پرے آذر بائیجان کا علاقہ ہے جس کا کچھ حصہ ایران کے صوبے آذر بائیجان میں شامل ہے اور بقیہ حصہ ایک علیحدہ ملک کی حیثیت رکھتا ہے۔

عہد رسالت میں آرمینیا کا علاقہ روم اور ایران کی سپر پاورز کے درمیان سرحدی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کا کچھ حصہ ایران اور باقی حصہ روم کے زیر اثر تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مکی زندگی کے زمانے میں روم اور ایران کے مابین اس علاقے میں شدید جنگ ہوئی۔ ایرانیوں نے ان جنگوں کو مجوسیت اور مسیحیت کے درمیان جنگ کا نام دیا۔ عیسائیوں کے جن فرقوں کو کلیسا نے بدعتی قرار دیا تھا، وہ اور یہودی اس جنگ میں ایرانیوں کے ساتھ تھے۔ شروع میں ایران کی افواج غالب آئیں۔ مکہ کے مشرکین کی ہمدردیاں ایران کے ساتھ تھیں کیونکہ یہ ان کے مشرک بھائی تھے جبکہ مسلمانوں کی ہمدردیاں عیسائیوں کے ساتھ تھیں کیونکہ یہ بہرحال توحید، نبوت اور آخرت پر ایمان رکھتے تھے۔ اسی دوران سورہ روم نازل ہوئی۔

''رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے ہیں اور اپنی اس مغلوبیت کے بعد چند سال میں وہ غالب ہو جائیں گے۔ اللہ ہی کا اختیار ہے، پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ اور وہ دن وہ ہوگا

جب اللہ کی بخشی ہوئی فتح پر اہل ایمان خوشیاں منائیں گے۔ اللہ جس کی چاہے مدد فرماتا ہے اور وہ زبردست اور مہربان ہے۔" (روم 30:1-5)

جب یہ آیات نازل ہوئیں تو مشرکین مکہ نے مسلمانوں کا خوب مذاق اڑایا کہ تمہارے خدا نے یہ کیا بات کر دی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایرانی افواج، رومیوں کو مارتے ہوئے تقریباً پورا اناطولیہ فتح کر چکی تھیں اور استنبول فتح کرنے کے قریب تھیں۔ جنوب میں انہوں نے پورا شام، فلسطین اور مصر فتح کر لیا تھا۔ سید ابوالاعلی مودودی لکھتے ہیں:

619ء تک پورا مصر ایران کے قبضے میں چلا گیا اور مجوسی فوجوں نے طرابلس (موجودہ لیبیا) کے قریب پہنچ کر اپنے جھنڈے گاڑ دیے۔ ایشیائے کوچک (موجودہ ترکی) میں ایرانی فوجیں رومیوں کو مارتی دباتی باسفورس کے کنارے تک پہنچ گئیں اور 617ء میں انہوں نے عین قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) کے سامنے خلقدون (موجودہ قاضی کوئی) پر قبضہ کر لیا۔ قیصر نے خسرو کے پاس ایلچی بھیج کر نہایت عاجزی کے ساتھ درخواست کی کہ میں ہر قیمت پر صلح کرنے کے لئے تیار ہوں۔ مگر اس نے جواب دیا کہ "اب میں قیصر کو اس وقت تک امان نہ دوں گا جب تک کہ وہ پابزنجیر میرے سامنے حاضر نہ ہو اور اپنے خدائے مصلوب کو چھوڑ کر خداوند آتش کی بندگی اختیار نہ کر لے۔" آخر کار قیصر اس حد تک شکست خوردہ ہو گیا کہ اس نے قسطنطنیہ چھوڑ کر قرطاجنہ (موجودہ تیونس) منتقل ہو جانے کا ارادہ کیا۔

شہنشاہ ایران خسرو کے غرور و تکبر کا اندازہ اس خط سے ہوتا ہے، جو اس نے یروشلم کی فتح کے وقت قیصر روم کے نام لکھا۔

سب خداؤں سے بڑے خدا، تمام روئے زمین کے مالک خسرو کی طرف سے اس کے کمینہ اور بے شعور بندے ہرقل کے نام۔ تو کہتا ہے کہ تجھے اپنے رب پر بھروسہ ہے۔ کیوں نہ تیرے

رب نے یروشلم کو میرے ہاتھ سے بچالیا۔

قرآن مجید کی اوپر بیان کردہ آیات میں یہ خوشخبری تھی کہ جب اہل روم غلبہ پائیں گے تو اسی زمانے میں اہل ایمان بھی کفار مکہ کے مقابلے میں غالب ہوں گے۔ ان آیات کے نزول کے چند ہی برس کے عرصے میں ایسا ہی ہوا۔ مودودی صاحب لکھتے ہیں:

622ء میں ادھر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لے گئے اور ادھر قیصر ہرقل خاموشی سے قسطنطنیہ سے بحر اسود کے راستے ترابزن کی طرف روانہ ہوا جہاں سے اس نے ایران پر پشت کی طرف سے حملہ کرنے کی تیاری کی۔ اس جوابی حملے کی تیاری کے لئے قیصر نے کلیسا سے روپیہ مانگا اور مسیحی کلیسا کے اسقف اعظم سرجیس نے مسیحیت کو مجوسیت سے بچانے کے لئے گرجاؤں کے نذرانوں کی جمع شدہ دولت سود پر قرض دی۔ ہرقل نے اپنا حملہ 623ء میں آرمینیا سے شروع کیا اور دوسرے سال 624ء میں اس نے آذربائیجان میں گھس کر زرتشت کے مقام پیدائش ارمیاہ (Clorumia) کو تباہ کر دیا اور ایرانیوں کے سب سے بڑے آتش کدے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ خدا کی قدرت کا کرشمہ دیکھیے کہ یہی وہ سال تھا جس میں مسلمانوں کو بدر کے مقام پر پہلی مرتبہ مشرکین کے مقابلے میں فیصلہ کن فتح نصیب ہوئی۔ اس طرح وہ دونوں پیشین گوئیاں جو سورہ روم میں کی گئی تھیں، دس سال کی مدت ختم ہونے سے پہلے بیک وقت پوری ہو گئیں۔

پھر روم کی فوجیں ایرانیوں کو مسلسل دباتی چلی گئیں۔ نینویٰ کی فیصلہ کن لڑائی (627ء) میں انہوں نے سلطنت ایران کی کمر توڑ دی۔ اس کے بعد شاہان ایران کی قیام گاہ دسکرۃ الملک کو تباہ کر دیا گیا اور آگے بڑھ کر ہرقل کے لشکر عین طیسفون (Ctesiphon) کے سامنے پہنچ گئے جو اس وقت ایران کا دارالسلطنت تھا۔

پروین سلطانہ حنا

حرف روشن ہوئے

لوحِ دل پہ لکھّا اے خدا، اے خدا
تیرا محبوب ہے مصطفٰی، مجتبیٰ
پھول، شبنم، کرن، چاندنی اور ہوا
گنگنانے لگی مل کے ساری فضا
حرف روشن ہوئے

صبحِ دم جب سیاہی کا پردہ اٹھّا
صوت کی دھڑکنوں نے اسے دی صدا
اور حمد و ثنا کا دیا جب جلا
اس کی توصیف سے گونج اٹھی فضا
حرف روشن ہوئے

چاند، سورج، ستاروں، بہاروں کو جب
میں نے حسنِ حقیقی کا جلوہ کہا
خوبصورت گلابوں کی خوشبو کو جب
اُس حسین، دل نشین کا سراپا لکھا
حرف روشن ہوئے

اس کی مدحت کی خاطر قلم کو چھوا
جسم و جاں نے محبت کا نغمہ لکھا
تیز چلنے لگی رحمتوں کی ہوا
اور بھی کھُل گیا پھر تو رنگِ حنا
حرف روشن ہوئے

ابو یحییٰ کی کتابیں

آخری جنگ

شیطان کے خلاف انسان کا اعلان جنگ

حکمت کی باتیں

حکمت کی وہ باتیں جو دنیا و آخرت میں کامیابی کی ضامن ہیں

ملاقات

اہم علمی، اصلاحی، اجتماعی معاملات پر ابو یحییٰ کی ایک نئی فکر انگیز کتاب

کھول آنکھ زمین دیکھ

مغرب اور مشرق کے سات اہم ممالک کا سفرنامہ

جب زندگی شروع ہوگی

ایک تحریر جو ہدایت کی عالمی تحریک بن چکی ہے

قسم اس وقت کی

ابو یحییٰ کی شہرہ آفاق کتاب ''جب زندگی شروع ہوگی'' کا دوسرا حصہ

Please visit this link to read all articles and books of Abu Yahya free online.

www.inzaar.org

To get Abu Yahya Quotes Join us on twitter:

Twitter ID: @AbuYahya_inzaar

To read Abu Yahya articles regularly Join us on Facebook

Abu Yahya Page: www.facebook.com/abuyahya.inzaar

Abu Yahya Account: www.facebook.com/abuyahya.jzsh

Join us on Youtube

Search inzaar on YouTube to see our audios and lectures

To get monthly books, CDs/USB and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Paksitan, contact # 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit

www.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to globalinzaar1@gmail.com

Following material in audio form is available on USB/CD:

Quran Course by Abu Yahya

Quran Translation and Summary by Abu Yahya

Islahi Articles

Jab Zindagi Shuru Hogi (book)

Qasam Us Waqt Ki (book)

Aakhri Jang (book)